بانو سرتاج

# دائروں کے قیدی

## بانو سرتاج

کے افسانے

ناشر: تناظر پبلی کیشنز، دلّی

Dr. (Mrs.) Sartaj Kazi    Beno Sartaj

M. A. (History, Hindi, Urdu) M. Ed. Ph. D. (Education)
P. G. Dip. in Gandhian Thought, Bhasha Snatak (Marathi)
Diploma in Rural Services.
Lecturer, Janata College of Education, CHANDRAPUR

c

اردو کے قارئین، طلبا، معلمین، ناقدین اور محققین کی نذر

کتاب ______ دائروں کے قیدی

کہانیوں کا مجموعہ

مُصنّف ______ بانو سرتاج

اشاعت ______ ۱۹۹۲

کتابت ______ اعجاز احمد و سراج الدین ساجد

سرورق ______ مکتی وریما۔ تحریک صادقین

طباعت ______ سپر پرنٹرز۔ دہلی

تقسیم کار

موڈرن پبلشنگ ہاؤس

۹ گولا مارکیٹ۔ دریا گنج۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

# انتساب

والد مرحوم شاہ محمدؐ ابراہیم کے نام

دائروں کے قیدی

کہانیوں کا مجموعہ

# فہرست

اقبال متین

# پیش لفظ

## معیاری تخلیقات کی ایک اہم دستاویز

اردو افسانے نے اپنی عمر کی ابھی ایک صدی بھی پوری نہیں کی لیکن زندگی کی ہر معنوی تہہ داری کو، ظاہر و باطن کو خارج و داخل کو بیروں و دروں کو اپنی مٹھی میں سمیٹ کر رکھ لیا۔ اب یہ عنقائی کبوتر مٹھی کی گرفت میں یوں پھڑپھڑاتا ہے کہ جہاں کھلی فضاؤں میں اس کی پرواز کے امکانات وسیع تر ہیں، وہیں بنجر زمین سے دانہ دانہ کونپلیں پھوٹ پڑنے کے مظاہر بھی اس کے لئے بکھرے پڑے ہیں۔ فرد کو افراد کو، ذات کو ذاتیات کو موجودات و موضوعات کو گھر کو کائنات کو اپنے قبضے و تصرف میں لاکر قاری کو لوٹانے والا افسانہ نگار، یہ بات طے ہے کہ قاری کے بغیر زندہ رہ ہی نہیں سکتا۔ اسباب و علل صاف ظاہر ہیں کہ افسانے کے یہی سارے اعمال و افعال اگر ہر ذی روح کا شعوری حصہ ہیں تو فن کار یکا و تنہا اس کی ملکیت کا ادعا کر ہی نہیں سکتا کہ اس کے پڑھنے والے بھی برابر کے حصے دار ہیں۔

اب وہ زمانے لد گئے جب لکھنے والوں نے بزعم خود ہمالہ کی چوٹی سے ارشاد فرمایا تھا کہ ہم افسانہ دو تین عالموں فاضلوں کے لئے لکھتے ہیں اور اگر وہ بھی ہمیں میسر نہیں تو خود اپنے لئے لکھتے ہیں۔

افسانہ جو اپنے باطن سے خود پھوٹتا ہے آپ کو یہ اجازت دے ہی نہیں سکتا کہ آپ اس کی امکانی رو کو، اس کی انسانی موانست کو اس کی جانب داری و غیر جانب داری کو اس کی محبت و کدورت کو کسی ایسے مخصوص انداز و عمل کا تابع و مطیع بنا دیں کہ وہ تجرید کا علامت کا ابہام و ایہام کا چولا بدل کر آپ کی فلسفہ طرازی کے آگے سر جھکا کر اپنی پہچان آپ کے قلم کے حوالے کر دے اور آپ اس کو اس کی صورت ہی کے لئے ترسا دیں۔

شاید یہی اسباب ہیں کہ اس صنف ادب نے جسے حیات انسانی کا استعارہ کہا جاتا ہے زندگی کے عرفان کے حصول میں اس درجہ معاونت کی ہو۔ ایسی صورت میں کہانی پر یہ اتہام کہ اس

کے کردار خیالی پیکر تراشی سے معرضِ وجود میں آتے ہیں عبث ہے۔ خیالی پیکر تراشی زندگی سے بعید از قیاس مصالحت کی بنیاد تو بن سکتی ہے، آج کے افسانے کی جڑوں میں بالیدگی بن کر سرایت نہیں کر سکتی۔ اس لئے کہ فن کی نمو پیکر نہیں تراشتی، پیکر میں جان ڈالتی ہے ـــــ اور یہ چلتا پھرتا پُتلا آپ کا ہم جنس و ہمزاد ہو کر ہم سفر ہو جاتا ہے اس کے باوجود آپ کو ایک حد تک اس سے (DETACH ہو کر) بے تعلق ہو کر اس کی نشو و نما کے لیے اسے کُھلی چھوٹ دینی پڑتی ہے۔ اور اگر آپ اسے چھوٹ دینے کے حق میں نہیں تو یہ خدشہ لگا رہتا ہے کہ آپ اس پر وارد نہ ہو جائیں اور اس کی اصلیت اور شخصیت میں آپ کا آپا حلول نہ کر جائے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ایسی صورت میں کہانی اپنی خوبیوں کو گنوا دیتی ہے، لیکن وسعتوں کو ایک حد تک سکیڑ لیتی ہے اور کیریکٹر (CHARACTER) کا ٹائپ (TYPE) یا پیٹرن (PATRON) بن جانا عین ممکن ہو جاتا ہے۔

یہ بات غلط ہے کہ کہانی کو اپنے زندہ وجود کے تسلیم کروانے کے لیے خوب صورت پیرایۂ اظہار کی توانائی کی ضرورت نہیں ہے ـــــ اچھا افسانہ بُنا اسی وقت جا سکتا ہے جب کہ آپ اس کے تانے بانے کے تخلیقی عمل کو تدریجی عمل سے ہٹ کر برتنے کی دسترس رکھتے ہوں۔ اسی تخلیقی عمل کو تدریجی تحریر کی تشگفتہ کاری۔ موضوع کو چھوتے ہوئے لفظیات کی جہاں گیری بیانیہ کا کُھلا کُھلا بانکپن جس میں معانی آفرینی کی گھلاوٹ بھی ہو کسک بھی۔ علامیت کا اژدہام میں دھیرے دھیرے انتقال ہی افسانے کو تاثر عطا کرتا ہے۔ اور BOREDOM سے بچا لیتا ہے۔ تحریر کسی صورت اظہار کو اپنا کے قاری کو اپنے ساتھ لے چلنے کی اہلیت سے محروم ہو تو افسانہ اپنی پُرکاری کھو دیتا ہے۔ یہاں تک کہ بدصورتی کو بھی خوب صورت اظہار کی ضرورت ہے اور کسی بدصورتی کا خوب صورت اظہار یہی ہے کہ بدصورتی اپنی اصلیت کے ساتھ تحریر میں سما جائے۔

ان حالات میں جب کہ جدیدی جدیدیت کا غلغلہ کہانی پر شب خوں مارنے کے جتن کر رہا تھا اور ناقدانِ فن ہر اس کج مج تحریر کو کہانی ٹھہرانے کے درپے تھے جو کہانی نہیں تھی کوئی ۱۹۶۶، ۶۷ کے لگ بھگ، ایک لڑکی نے ابوت محل سے ماہنامہ "صبا" کے لیے افسانہ بھیجا۔ ان دنوں سلیمان ادیب نے جنھیں مرحوم لکھتے ہوئے قلم رکتا ہے "صبا" کے افسانوی حصے کی ذمہ داری مجھ کو سونپ دی تھی اور ہم دونوں نے اس بات کو ایک حد تک پردۂ اخفا میں رکھا تھا۔ کچھ انتظامی سہولتوں کے باعث۔

کہانی مجھے جچی، میں نے چھاپ دی۔ پھر اس لڑکی سے خط وکتابت کا سلسلہ اس طرح سے رہا کہ کوئی کہانی میں نے لوٹا دی تو کسی کی تعریف کی اور چھاپ دی۔ مجھے یاد ہے کہ بانو سرتاج میں جو اس زمانے میں سرتاج بانو تھیں کہانی لکھنے کے سارے جوہر ڈھکے چھپے دمک اور تڑپ رہے تھے۔ ان میں جو SPARK تھا، جو کجلائی ہوئی سی کرن تھی اس کو پنپنے کا موقع فراہم کرنا اس لئے ضروری تھا کہ اگر نظر انداز کیا جاتا بھی تو وہ چنگاری ہواؤں کے دوش پہ اپنی تحریر کا کس بل لئے ایوانِ ادب میں در آتی۔ ہماری "صبا" کی پالیسی بھی یہی تھی کہ نئے لکھنے والوں کو زیادہ سے زیادہ موقع دیں جن میں ہنروری کی پیاس ہو۔

مجھے یاد ہے میں نے اس لڑکی کو لکھا تھا کہ بھئی افسانے لکھتی رہو کہ تم میں افسانے لکھنے کی صلاحیت ہے لیکن ساتھ ہی اپنی تعلیم بھی جاری رکھو۔ صرف گریجویشن سے کچھ نہیں ہوگا۔ ام اے کرو۔ پی ایچ ڈی کرو اور کسی یونیورسٹی کی پروفیسر بن جاؤ لیکن ساتھ ہی مجھ سے ایک وعدہ بھی کرو کہ جب تم کچھ بن جاؤ تو اپنے شہر کے زیادہ سے زیادہ بچوں کو مفت اردو پڑھانے کے جتن کرو۔ اس بات کا بیڑہ اٹھاؤ کہ اپنی مادری زبان سے کوئی بچہ تمہارے شہر میں محروم نہ رہے۔ بانو نے سب کچھ کر دکھایا۔ انھوں نے یہ ثابت کر دیا کہ ان کی ذہانت ہر اس ہنر کو دسترس میں لے سکتی ہے جس کے لئے وہ کوشاں رہیں۔ لیکن مجھے جُل دے گئیں۔ نہ صرف یہ کہ اردو کی تعلیم کو عام نہیں کیا۔ خود ہندی کی ہو رہیں۔ آج بانو سرتاج ہندی کی مستند ادیبہ ہیں۔ ہندی میں کہانیوں کے تین مجموعے شایع ہو چکے ہیں۔ کہانی جوان کی گھٹی میں پڑی تھی۔ میں جانتا تھا کہ اس کو پنپنے اور کھل کھیلنے کے مواقع فراہم کرنا بانو کے لئے بے حد ضروری ہے۔ اس لئے کہ کہانی جب اپنا وُجود وجود چاہتی ہے تو اظہار کے تتّو تتّو طریقے نکال لیتی ہے ___ وہ کسی کی کوکھ میں خاموش پڑی نہیں رہتی بانجھ پن کا الزام کہانی سہہ ہی نہیں سکتی۔ جب بانو نے اپنے میں تہی کہانیاں بسار کھی تھیں تو ان کا پھوٹ بہنا ضروری تھا ___ اردو میں فوری جگہ بنانے کے امکانات کم کم تھے۔ خود میری پیڑھی کو بڑی محنت کرنی پڑی تھی۔ کہانی کے بارے میں سوچ سمجھ کر اپنے الگ راستے بنانے پڑے تھے۔ ہمارے سامنے دیو قامت افسانہ نگار کھڑے تھے۔ ترقی پسند نظریات کی، اندھیروں سے نبرد آزما، زرتار شعاعوں میں آنکھ کھولنے کے بعد کرشن، بیدی، منٹو، قاسمی اور عصمت کے سامنے کھلے راستے تھے۔ کھلی فضا تھی۔ نشان دہی کے لئے سنگ میل تھے۔ انسان دوستی اور انسانی ہمدردی کے اعلیٰ اقدار روبرو تھے۔ زنجیر تھی، بیڑیاں تھیں لیکن وطن کی زندگی

کے چہرے پر غلامی کے باوجود آبرو سی تھی، ایک بھبن سی تھی۔ ہر قنوطی جذبے کا بارِ گراں رجائیت بڑھ کر اٹھا لیتی تھی۔ حیات بے آب و رنگ نہیں تھی —— ہمارے ہاتھوں آتے آتے افسانہ ششدر و حیران ہو کر رہ گیا تھا، اور اس لیے ششدر تھا کہ زندگی کا چہرہ مسخ ہو رہا تھا۔ لہو کے آستیں کو زبان خنجر کی پہچان ختم ہو رہی تھی۔ قدریں تہس نہس ہو رہی تھیں۔ ہر جذبۂ وفا پر درک و دانش یلغار کر رہی تھی۔ سارے بت ٹوٹ رہے تھے۔ اخلاقیات کی نفسیات ہی سرے سے بدل رہی تھی۔ غیر یقینی کچھ اس طرح امیدوں کا سینہ شق کر رہی تھی کہ محبتوں کا منہ فق ہو گیا تھا۔ وہ کیا ہے جو دکھائی دے رہا ہے۔ وہ کیا نہیں ہے جو دکھائی نہیں دے رہا۔ محنت کا ثمر کیا ہے؟ عجز کا جواز کیا؟ —— میں نے کہانی کی تلاش چھوڑ دی کہ پہلے زندگی کے موضوعات کا تنوع تلاش کروں پھر ان کو چھونے کا اپنا اسلوب۔ مجھے اپنے افسانے "کینڈل کالونی"، "آگہی کے ویرانے"، "مسدود راستے" اور "لکڑی کا آدمی" نے سہارا دیا۔ راقم الحروف، غیاث احمد گدی، جیلانی بانو۔ قاضی عبدالستار، اقبال مجید، رتن سنگھ، رام لال اور عابد سہیل، میرا خیال ہے کہ شاید ہم سبھوں پر یہ وقت آیا۔ قرۃ العین اور انور عظیم نے پھر بھی اردو کہانی کے لوچ تک رسائی حاصل کر لی تھی۔ نہ ہم آپس میں ملے نہ ہم نے کوئی "ٹیم ورک" (TEAM WORK) روا رکھا کیوں کہ جن مسائل کا ہمیں سامنا تھا ان سے آگہی تو سوچ بچار کے ذریعہ ہی ہو سکتی تھی کہ زندگی کی کھلی کتاب سامنے تھی اور انفرادی ورق گردانی بغیر کسی دوسرے اثر کے ردّ و قبول کے زیادہ امکانات اپنے دامن میں چھپائے ہوئے ہوتی ہے۔ ہم نے کہانی کو اپنے لئے تلاش کیا اور کہانی ہماری پذیرائی کے لئے آگے بڑھی۔ "جدید جدیدیت" کے ایک حلقے نے ہم پر دوغلی نسل کا الزام لگایا۔ ہم صرف اتنا جانتے تھے کہ الزام تراشی قوت تخلیق کو سر برہنہ نہیں کر سکتی۔ ہم لکھتے رہے۔ آج ہم آپ کے سامنے ہیں۔ کل نہیں ہوں گے۔ ہمارا یارگوئی نہیں رہا اردو کا مختصر افسانہ اس کو مٹا نہیں سکتا۔ ہم میں کچھ ہے تو زمانہ ہم کو بدیر سہی تسلیم کرے گا۔ ہم نے نظر اٹھا کر آج تک کسی ناقد کی طرف نہیں دیکھا۔ اس اعتماد میں اگر غلو ہے تو اس کی دھجیاں بکھر جائیں گی اور اگر فن کی صداقت ہے تو یہ دھجیاں اپنی پیوندکاری سے ایسا فرغل بنا لیں گی جسے پہن کر اردو افسانہ اترائے گا۔

ہمارے بعد کی نسل میں ایسی کہانی لکھنے والوں کے لئے راہ دشوار تھی جو کہانی کو فیشن زدہ علامیت اور ایہام پرستی کی سوچی سمجھی اِدعائیت سے بچا کر کہانی کی پہچان کے ساتھ اپنی شناخت کا سامان مہیا کرے۔

شرافت اور نجابت اپنی جگہ مسلم، یہی انسانی اخلاق کا پہلا زینہ سہی لیکن جب تک تخلیقی مزاج انسانیت گیر نہیں بنتا، عینک کے موٹے موٹے عدسوں میں بھی لکیریں پڑتی ہیں اور نظریں دھندلا دھندلا کر ٹٹولتی رہ جاتی ہیں۔ ہاتھ کیا آتا ہے۔ صرف ناک کی پھنگی پر ٹکی ہوئی عینک ــــ زندگی کے سمندر میں غواصی کے لئے عینک نکال پھینکنی پڑتی ہے، لباس تک اتار دینا ہوتا ہے۔ زندگی ماں کی آغوش کی طرح ننگ دھڑنگ ہم کو قبول کرتی ہے۔ چھاتیاں چھواتی ہے۔ نہ ذات پات، نہ رنگ روپ، نہ اونچا نیچا، نہ بھاؤ بھید۔ صرف جھوٹ اور سچ رہ جاتا ہے۔ اور یہ منزلیں اس وقت آتی ہیں جب آپ صد آفتوں کی آغوش سے ہمک ہمک کر پنڈ چھڑاتے ہیں۔ کامیاب ہو جاتے ہیں تب جھوٹ اور سچ بھی نہیں رہتا ــــ بانو سرتاج نے ٹرین کے سفر کو انسانی نفسیات کی ایسی ہی کشاکش کے وسیلے سے نہ صرف دیکھا ہے، ہمیں اسی شدت سے دکھایا بھی ہے۔ ادھر ان کے طرزِ بیان میں قابلِ لحاظ نکھار آیا ہے۔ ان کے افسانے کی زبان میں بیانیہ کی سادگی بھی ہے پرکاری بھی کہ ہم اسٹیشن پر ٹرین چھوٹنے سے پہلے اور ٹرین چھوٹنے کے بعد بھاگتے دوڑتے آدمی کے روپ میں اس کی نفسا نفسی اس کی ڈھکی چھپی خباثتیں، بیویوں کی صورت اپنے اطراف دیکھتے ہیں اور انھیں کا ایک حصہ بن جاتے ہیں اس چھوٹے سے میدانِ حشر میں وہ ساری جھلکیاں ہیں جن سے ہمیں پل صراط کے بعد بھی گزرنا ہے۔ کوئی کسی کا نہیں ہے ــــ کوئی بھی کسی کا نہیں ــــ یہاں تک کہ اللہ میاں بھی نامۂ اعمال دیکھنے کے لئے یہاں موجود نہیں ہیں ــــ شکار کا یہ اقتباس دیکھئے۔

"خالی ٹرین میں لوکو شیڈ سے سپاہی بیٹھ کر آتے ہیں۔ ٹرین کے پلیٹ فارم پر لگ جانے کے بعد ہی اندر سے دروازہ کھولتے ہیں۔ باہر والے سپاہی اشارے سے سمجھا دیتے ہیں۔ اندر والے اتنی سیٹیں روک لیتے ہیں ــــ پہلے یہ کام قلی کیا کرتے تھے۔ بہت لاقانونیت چلتی تھی۔ آج کل پولس والے یہ فرض نبھاتے ہیں اور اب یہ پولس انتظام کہلاتا ہے۔"

اور پھر . . . . . . . .

"قطار میں میرے پیچھے ایک ادھیڑ عمر کا بیوپاری تھا۔ چند لمحے پہلے ہی میں اسے قلی سے بات کرتا دیکھ چکا تھا۔ ظاہر ہے پیار محبت کی باتیں نہ ہوئی ہوں گی۔ میں نے دریافت کیا ــــ "کیوں سائیں؟ کتنا مانگتا تھا؟" بیوپاری نے چونک کر مجھے دیکھا۔ کہا "تیس روپے۔ اندھیر ہے اندھیر۔ اپن کو ہفتے میں دو بار بمبئی آنا پڑتا

ہے۔ ہر ٹیم تیس روپے دے کر سیٹ دے گا تو ہو گیا۔ پنڈتا دھار! وہ تو یے بار ہم دو اکھا رات سویا نہیں اس واسطے سو چار رات کو تھوڑا نیند ہو جائے تو اچھا پر تیس روپے پھوکٹ کا نہیں ہے ہمارے پاس"

"سنو سائیں تم سیٹ کی بات طے کر لو۔ تھوڑے صحت مند ہو۔ (یہاں بابا نے جان بوجھ کر تھوڑا کہا ورنہ بیوپاری تھوڑا نہیں بہت زیادہ صحت مند تھا۔) پھر پھیل کر بھی بیٹھنا۔ مجھے اپنے پاس جگہ دے دینا۔ میں تمہیں دس روپے دوں گا"

پکا بیوپاری تھا سائیں ـــــ بولا "نہیں بیس روپے دینا ـــ قلی کو پٹاؤنگا ہیں۔ جگہ روکوں گا میں۔ تم کیا کرو گے؟"

مجھے بڑا غصہ آیا۔ کچھ نہ کہہ کر میں نے اس کی طرف سے منہ پھیر لیا اور بس اسی وقت وہ نظر آئی ـــــ وہ ـــ جس کا ذکر میں نے سفر کے آغاز میں کیا تھا۔

اور جب اس حشر ساماں تنگ و دو میں اکھڑتے سانس کو اماں ملی تو ـــــ

"ٹرین اسٹیشن سے آگے چلی، اچانک مجھے اپنے سامنے کی سیٹ کے نیچے ایک بکسا سمانے کے اتنی جگہ نظر آئی ـــــ سردار کو کھڑا کر کے میں نے اپنا بکسا سیٹ کے نیچے کھسکا دیا۔ مقصد اس سے میرا یہ تھا کہ سردار کھڑا ہے اور اُس حسینہ کو نہ ستا سکے۔ مگر وہ بھی اول نمبر کا بدمعاش تھا۔ فوراً اپنا وی۔ آئی۔ پی سوٹ کیس اتار کر اس پر بیٹھ گیا ـــــ میں نے دل ہی دل میں اسے گالی دی ـــــ سور کا بچہ ـــــ اور میں کر بھی کیا سکتا تھا"

"بھیڑ میں بھٹکا ہوا آدمی" ٹرین کی ایک بوگی میں کانفرنس سے لوٹتے ہوئے مندوبین کی تنگ نظری۔ منافقانہ طرزِ عمل اور ریاکاری پر من دیبا شاہ کی گھٹن اور کڑھن کا ایسا شدید ردِ عمل ہے جس کا برملا اظہار اس ماحول میں ممکن نہیں جہاں جغرافیائی عصبیت ملک و قوم کی یگانگت کو ہر لفظ مجروح کرتی ہے۔ اس افسانے میں بانو سرتاج کی قوت مشاہدہ اور باریک بینی نے بوگی میں ہوتی ہوئی کج بحثی اور الزام تراشیوں سے گریز کی کوئی احتجاجی صورت نہ پا کر کئی سوال اٹھائے ہیں جو اہم ہیں۔

اب اس اقتباس پر ہی اکتفا نہ کیجئے۔ کہانی پڑھ کر ان کے سلیقۂ اظہار کی داد دیجئے۔

"تشار کو خجل ہوتا، دیکھ کر دیبا کو حیرت ہوئی۔ عام طور پر اس طرح کے حالات میں موضوع بدل دیتے ہیں ـــــ وہ بے چارے بھی کیا کریں جو ہدف ملامت بنتے ہیں۔

ایک مخصوص قوم سے تعلق رکھنے کی بنا پر ان کی حب الوطنی ہمیشہ مشکوک رہی ہے اور رہے گی۔ یوں تو ملک کے لئے وہ بھی سر سے کفن باندھتے ہیں ـــــ مگر ان کی وفاداری پر لگا ہوا سوالیہ نشان بڑا ہی ہوتا جاتا ہے۔ اگنی پریکشا کے بعد بھی سیتا کی پاک دامنی پر شک کرنے والوں کا دیش ہے یہ۔ دلوں میں جھانک کر کون دیکھتا ہے۔ دیش بھگتی کا نعرہ لگانے والے فرقہ وارانہ جذبات کی آگ بھڑکا کر دیش کے اتحاد و اتفاق کی جڑیں کس طرح کھوکھلی کر رہے ہیں یہ سب پر عیاں ہے۔ پھر بھی ان پر کوئی انگلی نہیں اُٹھاتا ـــــ وہ حب الوطن ہیں کیوں کہ اسی ایک مخصوص قوم کے نہیں ہیں۔

تشار صاحب، آپ نے یہ خاموشی کیوں اختیار کر لی ؟ کیا میرا نام کسی مجرم کا پتہ دیتا ہے ؟"

یہ اور بات ہے کہ اِس اہم موضوع پر ایک بھرپور کہانی الگ سے لکھی جاسکتی ہے۔ اس طرح کہ حالات اور ماحول کے بطن سے کہانی خود پھوٹے اور دل شکستہ و دل برداشتہ مخصوص کرداروں کے جذبہ و احساس کی منھ بولتی تصویر بن جائے ـــــ لیکن "بھیڑ میں بھٹکا ہوا آدمی" میں نکاتِ نظر کی جو آویزش ہے اس کا سہارا لے کر افسانہ نگار کے لئے دو ٹوک طرزِ نگارش ہی واحد راستہ ہے۔

بانو سرتاج کو پڑھتے ہوئے یہ احساس ہوتا ہے کہ جس تجسّس کو انھوں نے اپنا شعار بنا رکھا ہے اسی تجسّس نے ان کی کہانیوں میں تنوع کے کتنے ہی روزن بنا رکھے ہیں جن سے وہ جھانکتی ہیں ـــــ کیوں ؟ کیا ؟ اور کس طرح ؟ کی تثلیث تخلیقی بصیرت کو صیقل کرتی ہے۔ وہ کہانی کو چھونے سے پہلے اس کے اندر اتر جانے کا گُر جان گئی ہیں۔ جیسے غم آنسو بننے سے پہلے دل میں اُتر جاتا ہے ـــــ کبھی کبھی کہانی لکھتے ہوئے یہ احساس بھی ہوا کرتا ہے کہ اس کا کردار نہیں مر رہا ہے۔ ہم مر رہے ہیں ـــــ لیکن یہ کبھی کبھی ہوتا ہے۔

"تین بوڑھے" اور "ایک گھونٹ زہر" ہماری نیلام پر تلی ہوئی تہذیب کی ایسی کہانیاں ہیں جو جبر و استبداد کے آگے سپر ڈال کر سب کچھ سہہ جانے میں زندگی کی عافیت سمجھتی ہیں۔ دونوں کہانیوں کا موضوعاتی بوقلموں تنوع دکھ درد کی حد آگاہ صورتیں رکھتا ہے۔ "تین بوڑھے" میں انفرادیت کے استحصال سے سمجھوتے کی مجبوریاں بے سہارا رشتوں اور محبتوں کو اقدار کی شکست و ریخت کے ہاتھوں زندہ درگور رہ کر بھی سب کچھ سہہ جانے پر آمادہ کر چکی ہیں۔

یہی مجبوریاں "ایک گھونٹ زہر" میں پٹھانیت کے جلال و جبروت کو آن واحد میں اس درجہ پامال کر دیتی ہیں کہ انسپکٹر خان اپنے اقتدار کی تحکیم اور قومیت کے پندار کی کرچیاں بکھر جانے پر بھی اپنی حسین خوب صورت بیوی کی عصمت دری کی پردہ پوشی کو بدنامی کے خوف سے فراریت کا جواز بنا لیتا ہے اور بغیر کسی احتجاج کے وہ شہر ہی چھوڑ دیتا ہے جہاں اس پر قیامت ٹوٹی تھی ـــــ تین بوڑھے میں کہانی کا دروبست زیادہ مضبوط اور فنکارانہ ہے ۔

- "اکثر اپنے مکان کے دریچے میں کھڑی، میں انھیں دیکھتی رہتی ہوں ـــــ قیدیوں کو دیکھنے کا شوق ہے مجھے "

- - - - - -

- " شام کو بھی قیدیوں کے کچہری سے لوٹتے وقت میں ان کے چہروں کو بغور دیکھتی ہوں پرامید چہرے، ناامید چہرے، امید ناامیدی کے سائے میں گھراتے چہرے میں اب خوب پہچاننے لگی ہوں "

- - - - - -

- "کئی مرتبہ کے سزا یافتہ قیدی، قاتل، دہشت پسند، نکسل وادی وغیرہ عام انسان سے کہاں مختلف ہو جاتے ہیں ؟ ۔
عورت، ممتا کی مورت، مجرم بن کر کیسی لگتی ہے ؟ ان سوالات کے جوابات مجھے نہیں ملے "

- - - - - -

- "ان میں سے کلف لگے کپڑے پہننے والا بوڑھا اکثر میرے کمپاؤنڈ کے باہر جھکی ہوئی کنیر اور موگرے کی شاخوں سے پھول توڑا کرتا ہے ۔ یقیناً وہ یہ پھول اپنی شریک زندگی کے لئے جاتا ہوگا ـــــ تو وہ اُس کے ساتھ کبھی نظر کیوں نہیں آتی ؟ ـــــ یہ کون بتاتا مجھے ؟ میں پوچھ بھی نہیں سکتی تھی "

- - - - - -

- "سویرے کی سیر میں موسم کی سختی ان کے لئے رکاوٹ نہ بنتی ۔ بارش ہوتی تو چھتری لے کر چلتے ـــــ سردی پڑتی تو گرم اونی کپڑوں سے لدے پھندے ہوتے ـــــ میں سوچتی کاش ان میں سے ایک کسی دن نہ پہنچے "

"فرستان" بھی سجل، سنبھلی ہوئی اور آہستہ خرام کہانی ہے۔ عورت کی مجبوریاں یہاں تک ہیں کہ وہ ممتا کی تقدیس میں بھی کسی راندۂ زندگی غم زدہ کو اپنا نہیں سکتی۔ عورت اور اس کے نت نت روپ کا گمبھیر تقدس بانو سرتاج کا خاص موضوع ہے۔ انھوں نے اس کہانی میں بھی جزئیات نگاری کا سلیقہ نبھایا ہے اور کلائمکس ( CLIMAX ) کو اثر انگیز موڑ دے کر سوربھ کو زندگی کی بھاگ دوڑ میں ہمارے ساتھ کر دیا ہے۔ سوربھ کا وطن چھوٹتے وقت کرشنا سے نہ ملنا کہانی کو ایک بار پھر TWIST کرتا ہے اور کرشنا کے ساتھ ہر ممتا کو جھنجوڑتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے من کی جھنجھری سے راکھ گر رہی ہو۔

"میں جا رہا ہوں، گھر اور شہر چھوڑ کر۔ جاتے وقت آپ سے ملاقات اس لئے نہیں کی کہ کہیں میرا ارادہ کمزور نہ پڑ جائے ـــــ میرا یہ عقیدہ کہ اس شہر میں اب اپنا کہنے کو کوئی نہیں رہا۔ آپ کے سامنے آ کر جھوٹا ثابت ہو جاتا ہے۔ پھر میں آپ کو مجھے پناہ نہ دے پانے کی مجبوری کا غلام نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔"

افسانہ "بجوکا" معاشرتی اور معاشی استحصال کا ایسا المیہ پیش کرتا ہے جو جھوٹ اور سچ کے بیچ، حق و باطل کے درمیان خطِ فاصل کھینچنے کی اہلیت سے برج موہن کو اس لئے محروم کر دیتا ہے کہ وہ اپنی بے بضاعتی اور بے توقیر زندگی کے آگے شکست خوردگی کو بے چون و چرا تسلیم کر لے۔ لیکن برج موہن کا احساس ذہن اس پیکار میں بے ضمیری سے سمجھوتہ نہیں کر سکتا اور وہ اپنی ہی آگ میں جلتا رہتا ہے ـــــ اختتامیہ پر بانو سرتاج کے قلم نے طنز کے وہ نشتر رگِ جاں کے قریب رکھ دئے ہیں کہ برج موہن سے اس کی بے بسی پر صرف ہمدردی نہیں ہوتی بلکہ بجوکا رائے کے کاری زخم اپنے اندمال کو ترستے ہوئے ہمیں صاف نظر آتے ہیں۔

"ربجو میرے راجہ آ گئے تم۔ رک کیوں گئے ـــــ اندر آؤ نا!"

نیہا نے پیار بھرے لہجے میں پکارا

برج موہن ہنس پڑا۔ زور زور سے قہقہے لگانے لگا ـــــ پاپا ممی دوڑے آئے۔

"برج ـــــ برج موہن ہوش میں آؤ ـــــ کیوں ہنس رہے ہو؟"

کسی اندیشے سے زرد پڑ کر پاپا اسے جھنجوڑنے لگے۔

"برج — کون برج ؟" — برج موہن تن کر کھڑا ہو گیا — ڈرامائی انداز میں سینے پر ہاتھ رکھ کر کچھ جھکا پھر سیدھا کھڑا ہو کر بولا۔

"میں قبول کرتا ہوں کہ میرا نام بجو کا ہے۔ بجو کا رائے — نیہار رائے کا پتی — میں یہ بھی قبول کرتا ہوں کہ پنکی میری بیٹی ہے — اور نیہار رائے کی گود میں لیٹا ہوا ننھا بچہ بھی میرا ہی ہے۔ میں اپنے پورے ہوش و حواس کے ساتھ بہ اصرار یہ کہہ رہا ہوں کہ میں بجو کا ہوں — بجو کا رائے ؛؛

افسانے کے لئے بانو سرتاج کافی سلجھی ہوئی ستھری زبان لکھتی ہیں۔ بعض جگہ بے تکلف ہندی الفاظ کا استعمال کرتی ہیں لیکن بعض وقت فارسی یا عربی کی آمیزش کے شوق میں جملے کے معنی ہی بدل کر رکھ دیتی ہیں۔ جیسے اسی افسانے میں ہجیز کا استعمال۔ اب الغیبس ان باتوں کی طرف بھی توجہ دینی چاہیئے — الفاظ کی استعانت مختصر افسانے میں انگوٹھی میں جڑے نگینے کی دمک کی طرح ہے افسانے کی لفظیات افسانے کو زنجیر در زنجیر گرہ در گرہ کس کر رکھتی ہیں اور اسی کساو کی معنوی کشادگی سے افسانہ نکھرتا جاتا ہے۔ بانو سرتاج اس کا بڑی حد تک خیال رکھتی ہیں لیکن ان کے بعض افسانے اس کس بل سے عاری بھی ہیں۔ ایسے اسقام، ایسی سلوٹیں کم زیادہ کس کے پاس نہیں ہیں لیکن احتیاط ہم سب پر لازم ہے۔

اس مجموعے میں بانو سرتاج کی سب سے مختصر کہانی "بھیک" ہے۔ جس کا ترجمہ ہندی، مراٹھی، کنڑ اور اڑیا میں شایع ہو چکا ہے۔ اس کہانی کے اختصار نے اس کو بہت سنبھالا دیا ہے — تاثر کی شدت سے یہ کہانی ایک حد تک اس لئے عاری ہے کہ 'بی بی جی' کے بانجھ پن کی محرومیوں سے بانو نے وہ فضا پیدا نہیں کی جو قاری کی دل گرفتگی کا باعث بنتی — لگتا ہے جیسے یہ کہانی "بھیک" کے عنوان کے پیش نظر لکھی گئی ہے — لیکن اتنی زبانوں میں اس کی پذیرائی خود میرے نظریئے کو بھی غلط ٹھہرا سکتی ہے اور بانو کے لئے باعثِ طمانیت ہو سکتی ہے۔

"عورت" مجبور محض نسائیت کی ایسی داستانِ پارینہ ہے جو مرد کے جبر اور استبداد کے آگے اپنی عزت و توقیر کو داؤ پر لگا کر بھی مصالحت پر اتر آتی ہے اور مرد کے پچھتاوے پر اتنا نرم گوشہ اپنے دل میں چھپا دیکھتی ہے کہ اس کو نہ صرف معاف کر دیتی ہے بلکہ دیوتا سمان سمجھ کر پھر سے اپنا آپا تج دیتی ہے اور خود کو خوش آئند خوابوں کے حوالے کر دیتی ہے۔

بانو سرتاج کہانی کو بڑے ڈھنگ سے سمیٹتی ہیں۔ لیکن بعض وقت جب وہ گول (GOAL) کی جانب بڑھتی ہیں تو قریب پہنچ کر اتنی طاقت ور اور نپی تلی کِک (KICK) نہیں لگا پاتیں کہ گیند گول میں دھنس جائے ــــ ان کا قاری جو ایسے میں ان کا گول کیپر بھی ہے گیند کو پکڑ لیتا ہے۔ وہ تحیّر کی اس کیفیت سے نہیں گزر پاتا کہ میرے چھلانگ لگا کر گیند کو روکنے کے باوجود گیند کس طرح گول میں گھُس پڑی ــــ" وہ ایک لمحہ" اور "انجام" میں یہی فرق ہے۔ وہ انجام میں گول نہیں بنا پاتیں۔ ویسے دونوں کہانیوں میں اپنے قاری کو شروع ہی سے اپنی گرفت میں لے لینے کا یارا ہے۔ جو کہانی کے صرف آغاز ہی کا وصف ہے۔ وہ ایک نفسیاتی عقدہ کشائی سے سنبھل جاتا ہے اور اثر چھوڑتا ہے۔

میں نے بانو سرتاج کے اس مجموعے کی کہانیاں سلسلہ وار نہیں پڑھیں اسی لئے میں نے ان کے تعلق سے بات بھی تقدیم و تاخیر کو ملحوظ رکھے بغیر کی ہے۔

میں نے جو آخری کہانی پڑھی ہے، وہ ہے "احساس کی آنچ" اس کہانی میں بانو سرتاج نے جزئیات نگاری اور جذبات نگاری کا کمال دکھایا ہے ــــ شروع سے آخر تک آپ اس کہانی میں غریب، نادار، کم حیثیت اور نچلے متوسط طبقے کی لڑکیوں کے ہوسٹل میں بانو کے نوکِ قلم کے ساتھ صریر خامہ کی طرح چلتے ہیں۔ کرداروں سے ملتے ہیں۔ مجبور ہی نہیں جبر آشنا لڑکیوں سے ہمدردی محسوس کرتے ہیں۔ تائی کے استبداد و استحصال سے تنفّر کا جذبہ آپ کے دل میں بھی ابھرتا ہے ــــ بانو نے افسانے کے دروبست میں سلیقہ مندی کا ایسا مظاہرہ کیا ہے جو انھیں فن کاری کی سرحدوں میں لے جاتا ہے۔ اختر اورینوی کی کہانی "سینی ٹوریم" یاد آتی ہے ــــ لگتا ہے بانو کی باریک بیں نگاہوں کے آگے کہانی خود کو سونپ کر کاغذ پر بکھتی جاتی ہے۔

شام بازار کے نکڑ پر پہنچ کر میما نے ٹیکسی رکوادی پھر اتر کر کرایہ ادا کیا۔ اسٹیٹ بنک کی عمارت سامنے ہی تھی۔ نزدیک سے گذرتے ایک بچے کو روک کر اس نے پوچھا "بیٹے۔ شرما صاحب کہاں رہتے ہیں؟ بتا سکو گے؟"
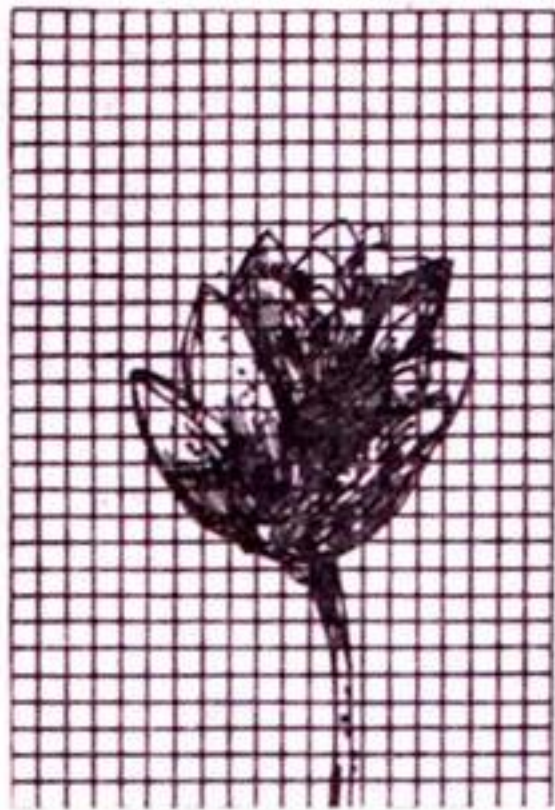
"کون سے شرما؟ یونیورسٹی والے؟"

بچے نے کچھ اس طرح استفسار کیا جیسے آس پاس تین چار شرما خاندان آباد ہوں اور امتحانات کے بعد کے ان دنوں میں کوئی کسی شرما کو پوچھے گا تو ضرور یونیورسٹی والے شرما ہی کو پوچھے گا۔ اور وقت چاہے کوئی ٹیچروں لکچراروں کو گھاس نہ ڈالے، لیکن امتحانات کے بعد ان کے مکانوں کے چکر کاٹنے والوں کی تعداد دیکھ کر لگتا ہے کہ ہاں، ان کی بھی کوئی اہمیت ہے۔

میما نے کہا "نہیں، یونیورسٹی والے نہیں، وہ سشیل شرما، جو ناگپور میں ملازمت کرتے ہیں۔"

بچہ اپنے قیاس کے غلط ہو جانے سے کچھ خجل ہو گیا۔ بے دلی سے ایک طرف اشارہ کر کے بولا۔ "وہ سامنے کا چوتھا مکان ہے۔"

میما نے اس کی انگلی کی سیدھ میں دیکھا۔ یقینی طور پر سمجھ نہیں پائی کہ اشارہ کس
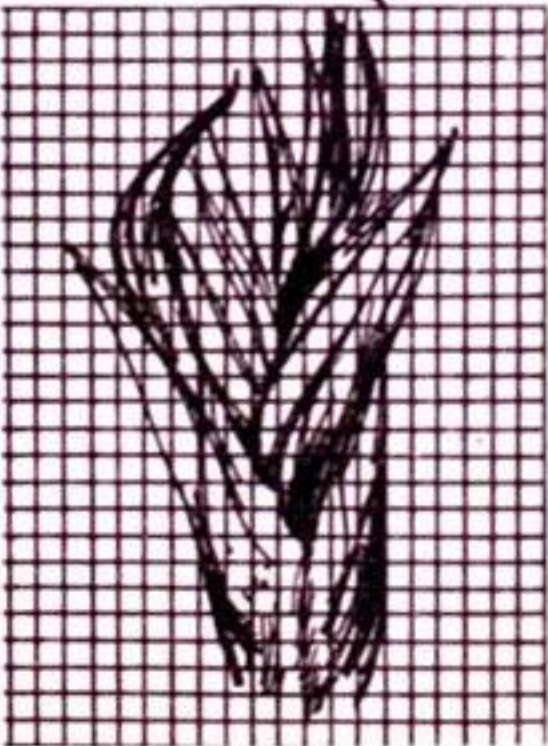
مکان کی طرف ہے اس لیے کہا، پلیز وہاں تک چل کے دکھاؤ نا،،

پلیز تخاطب سے کی گئی درخواست سے بچے کو اپنا بھاؤ بڑھتا محسوس ہوا، لپک کر آگے ہو لیا۔ سُنیل شرما کے مکان تک پہنچ کر بیل بھی خود ہی بجادی۔ ایک ادھیڑ عمر کی عورت نے دروازہ کھولا۔ بچے نے میپما کی طرف اشارہ کر کے کہا ''آپ کے گھر مہمان آئے ہیں،، پھر میپما سے 'اچھا میں چلتا ہوں' کچھ اس بڑپن سے کہا جیسے کہا ہو میری ذمہ داری ختم ہوئی۔ اب تم جانو اور تمہارا کام۔

''تھینک یو بیٹے،، میپما نے مسکرا کر اس کا شکریہ ادا کیا۔ پھر وہ دروازہ کھولنے والی عورت کی طرف متوجہ ہوئی جو سوالیہ نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ میپما نے دریافت کیا ''آپ شریمتی سنیل شرما ہیں؟،،

''جی ہاں! آپ شرما صاحب سے ملنا چاہتی ہیں؟ وہ گھر پر نہیں ہیں،،

'' مجھے آپ سے ملنا ہے،،

عورت ایک لمحے کے لیے جھجکی پھر دروازہ پورا کھول کر بولی ''آئیے اندر آئیے،،

میپما سیڑھیاں چڑھ کر کمرے میں داخل ہوئی۔ پہلی ہی نظر میں اس نے کمرے کا بغور جائزہ لے لیا۔ کمرہ بیٹھک 'اسٹور ی روم وغیرہ' کمروں کے ملے جلے مقاصد کی تکمیل کرتا نظر آتا تھا۔ ایک طرف پلنگ تھا جس پر بچھی گہرے رنگ کی چادر بہت میلی نہیں تھی' تو صاف بھی ہر گز نہیں کہی جا سکتی تھی۔ اس کی سلوٹیں تک ٹھیک نہیں کی گئی تھی۔ دوسری طرف صوفہ تھا جس کی پشت پر کا کپڑا تیل سے چیکٹ ہو رہا تھا۔ ایک کونے میں میز تھی جس پر بچوں کی اسکولی کتابیں بے ترتیبی سے پھیلی ہوئی تھیں۔ بغیر کواڑوں والی الماری میں بچوں کی کتابیں، بستے، بلّے، پتنگ وغیرہ رکھے ہوئے تھے۔ مجموعی طور پر کمرے کی حالت خاتون خانہ کے سلیقے اور سگھڑپن کی مظہر ہر گز نہیں تھی۔

میپما صوفے کے ایک کونے پر ٹکتی ہوئی بولی ''پلیز، پہلے ایک گلاس پانی پلائیے۔ بہت دھوپ پڑتی ہے آپ کے شہر میں...

''او ہاں.... میں ابھی لائی....،، کہتی ہوئی وہ عورت تیزی سے مڑ کر اندر چلی گئی۔ اس کی پشت میپما کی طرف ہوئی تو اس نے دیکھا بے حد اونچا چولی نما بلاؤز پہنے تھی جس میں سے برے بسیرز کے ہک پشت پر لٹک آئے تھے۔ میپما کے منھ میں کڑواہٹ سی بھر

گئی۔ اسے متوسط طبقے کی عورتوں کی دو عادتوں سے خدا واسطے کا بیر تھا۔ اوّل تو یہ کہ یہ عورتیں فیشن کا مطلب سمجھتی ہیں نہ موقع اور مناسبت کو مدنظر رکھتی ہیں۔ شوخ و تنگ کپڑے پہن کر سرخی پاؤڈر تھوپ لینا ان کے نزدیک فیشن پرست کہلانے کے لیے کافی ہے فیشن کے مطابق اونچا بلاؤز پہن لیں گی مگر یہ دیکھ لینے کی احتیاط نہیں برتیں گی کہ برسیئر کے ہک برابر لگے ہیں یا نہیں، کندھے پر، یا پشت پر بلیٹ یا ہک باہر تو نہیں لٹک رہے ہیں ۔۔۔۔ دوسری عادت جسے وہ پسند نہیں کرتی تھی وہ تھی عورتوں کی پاؤں کی ایڑیاں صاف نہ کرنے کی عادت۔ اچھی سے اچھی ساڑی پہنیں گی، منھ پر پاؤڈر تھوپیں گی۔ سرخی لگائیں گی۔ مگر کالی ایڑیوں کو صاف کرنے کا وقت ملے گا نہ دھیان آئے گا۔ گندی پھٹی ایڑیوں میں باتھ روم سلیپر پھٹکارتی چلی جائیں گی۔

"پانی لیجئے۔۔ وہ پانی کا گلاس تھامے کھڑی تھی۔ میمانے چونک کر گلاس اس سے لے لیا پھر گھونٹ گھونٹ پانی پیتے ہوئے وہ اس عورت کو دیکھنے لگی جو مسز سنیل شرما کہلاتی ہے۔۔ سنیل ٹھیک ہی کہتا تھا کہ اس کی بیوی اعلیٰ تعلیم یافتہ نہیں ہے نہ کوئی کام ڈھنگ سے کرنا جانتی ہے۔ اسے پہننے اوڑھنے کا سلیقہ ہے نہ بات چیت کے فن سے وہ واقف ہے۔ اسے صرف تین باتوں سے دلچسپی ہے۔۔۔۔ پڑوسنوں سے باتیں کرنا پڑوسنوں کی برائیاں کرنا اور پڑوسنوں کی خوشحالی دیکھ کر جلنا کڑھنا اور اپنی قسمت کو کوستا۔،

"معاف کیجئے۔ کیا آپ اپنا تعارف کرانا پسند کریں گی؟" سنیل کی بیوی انجلی نے اسے اپنی طرف گھورتے دیکھ کر سپٹا کر پوچھا۔

"مجھے مینی کھنہ کہتے ہیں" میما کی زبان پر بے ساختہ اپنی ایک رپورٹر دوست کا نام آگیا۔ وہ حیران رہ گئی۔ اس بے ساختہ جھوٹ کا یہ مطلب ہوا کہ جھوٹ کی جڑ میں کہیں نہ کہیں سچ پوشیدہ ہوتا ہے۔ جھوٹ ہمیشہ ہی بے بنیاد نہیں ہوتا۔ وہ اپنا صحیح نام اور آمد کا صحیح مقصد انجلی کو نہیں بتا سکتی تھی۔ اب نام رپورٹر کا بتایا تھا تو کام بھی ویسا ہی کچھ بتانا تھا۔ اس نے کہا۔

"میں خواتین کے ایک میگزین کے لیے ایک سروے کر رہی ہوں کہ شوہر کی زندگی میں بیوی کے ہوتے ہوئے دوسری عورت کے آنے کی کیا وجوہات ہو سکتی ہیں؟ تیسری

اور دیہاتی علاقے سے، اعلیٰ متوسط، اور نچلے طبقے سے، ملازم پیشہ اور گھریلو غرضیکہ ہر طبقے ہر فیلڈ سے خواتین کا انتخاب کر کے میں ان کا انٹرویو لے رہی ہوں . . . میرا نام آپ نے سنا ہو گا۔ میں بہت سے رسائل کے لیے لکھتی ہوں، سماجی و فلاحی کاموں میں بھی پیش پیش رہتی ہوں۔"

"میں رسائل وغیرہ نہیں پڑھتی۔ ادب وغیرہ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ اول تو گھر کے کاموں اور بچوں کی وجہ سے فرصت ہی نہیں ملتی دوسرے کبھی جی چاہتا بھی ہے تو لائبریری سے جاسوسی ناول لاکر پڑھتی ہوں" انجلی لاپرواہی سے بولی۔

مہما کو اطمینان ہوا کہ انجلی دیپتی کھنہ کو نہیں جانتی۔ سنیتل نے بتایا بھی تھا کہ ادب انجلی کے لیے ادرک ہے۔ حالاتِ حاضرہ سے واقفیت بھی نہیں کے برابر ہے۔ "لیکن دیپتی جی۔" انجلی کچھ پس و پیش کے بعد بولی "میں آپ کی کیا مدد کر سکتی ہوں؟" میں تو پڑھی لکھی نہیں ہوں۔"

مہما نے کہا "آپ میرے چند سوالات کے جوابات دے کر میری مدد کر سکتی ہیں۔ میں نے پتہ کیا ہے کہ آپ کے شوہر دوسرے شہر میں ملازمت کرتے ہیں. . . شاید ناگپور میں ہو سکتا ہے وہاں کوئی دوسری عورت ان کی زندگی میں داخل ہو گئی ہو. . . آپ سمجھ جایئے نا۔ میں اس موضوع پر آپ سے تفصیل سے گفتگو کرنا چاہتی ہوں۔"

"تب تو آپ کو تھوڑا سا انتظار کرنا ہو گا۔ آپ جب آئی تھیں تب میں روٹی بنا رہی تھی میرے بچے اسکول سے آتے ہوں گے۔ وہ آتے ہی کھانا مانگیں گے۔"

"ضرور میں بیٹھتی ہوں۔ آپ اپنا کام نبٹا آیئے۔" انجلی ایک پرانا میگزین اس کے ہاتھوں میں تھما کر اندر چلی گئی۔

مہما دراصل خود تنہائی چاہتی تھی۔ کم از کم اتنے وقت کے لیے جس میں وہ سنیتل سے اپنی ملاقات سے لے کر آج اس کی بیوی انجلی سے ملاقات تک کی کڑیوں کو جوڑ کر اپنا آئندہ کا پروگرام طے کر سکتی۔

ڈیڑھ برس پہلے کی بات ہے. . . کار چلاتے ہوئے مہما ہمیشہ کی طرح خیالوں میں ڈوبی ہوئی تھی مگر اتنی بے خود ہرگز نہیں تھی کہ کسی پر کار چڑھا دیتی۔ پھر بھی سنیتل کو بچاتے بچاتے بھی دھکا لگ ہی گیا تھا۔ اسے کافی چوٹ آئی تھی مہما نے دو راہگیروں کی مدد سے

اسے اٹھا کر اپنی کار میں ڈاکٹر دتہ کے نرسنگ ہوم میں پہنچایا تھا ۔۔۔ پھر اس کے صحت یاب ہونے تک اس کی خیر گیری کی تھی ۔

ایک دن سنیل کو سیب کاٹ کر دیتے ہوئے اس نے پوچھا تھا " یہ تو بتائیے مسٹر شرما کہ آپ مجھے کس جنم کا بیر نکالنے جا رہے تھے ؟ "

" جی ! میں کچھ سمجھا نہیں ؟ " سیب لینے کے لیے بڑھا ہوا سنیل کا ہاتھ رک گیا تھا ۔
آپ کو خودکشی ہی کرنی تھی تو شہر میں کنوئیں تالاب کم نہیں تھے ۔ بلا وجہ مجھے مصیبت میں پھنسانے سے تو وہی بہتر ہوتا " ۔

" میں ۔۔۔ میں خودکشی نہیں کرنا چاہتا تھا میماجی ، وہ نظریں نیچی کئے کئے بولا ۔
کیوں ؟ کیا میں نے دیکھا نہیں " آپ اتنے اطمینان سے کار کے سامنے آ لیٹے جیسے باغ میں ٹھنڈی گھاس پر لیٹنے جا رہے ہوں ۔۔ میما رک کر تھوڑا سا ہنسی پھر بولی ۔۔۔ " ذرا سوچو تو ، تم اپنے ارادے میں کامیاب ہو گئے ہوتے تو میں اس وقت کہاں ہوتی ۔ "
میما آپ سے تم پر آ گئی تھی شاید سنیل سے اپنے لیے میماجی کا تخاطب سن کر
" مجھے معاف کر دیں ۔ میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا ۔ میں ذہنی طور پر بہت زیادہ پریشان تھا ۔ دن بھر سے کچھ کھایا بھی نہیں تھا ۔ آنکھوں میں اندھیرا چھا رہا تھا ۔ آپ کی گاڑی کا ہارن سنائی ہی نہیں دیا ۔ بس اسپتال میں ہی آنکھ کھلی "

" ایسی بھی کیا پریشانی تھی کہ دوسروں کو جان مصیبت میں ڈال دی ۔ تمہیں کچھ ہو جاتا تو پولس مجھے گرفتار نہیں کر لیتی ؟ تم صفائی پیش کرنے وہاں تھوڑے ہی آتے ۔ خیر چھوڑو کیا پریشانی تھی تمہیں ؟ جان سکتی ہوں ؟ "

سنیل تذبذب میں تھا ۔ سوچ رہا ہوگا میما کو اپنی پریشانی سے واقف کرائے یا نہ کرائے کہ اسی وقت میما نے ایک پرچی اس کی طرف بڑھائی اور کہا ۔۔۔ " نہ بتاؤ ۔ میں جان گیا ہوں ۔ تمہیں اسپتال پہنچانے کے بعد تمہاری جیبوں کی تلاشی اس غرض سے لی تھی کہ تمہارے گھر کے لوگوں کو حادثے کی خبر دے سکوں ۔ ہاتھ لگا تمہاری بیوی کا خط ۔ میں نے اسے پڑھ لیا ۔۔۔ یہ تین ہزار روپئے کی رسید ہے ۔ میں نے تمہارے نام سے تمہاری بیوی کو روپے بھیج دیئے ہیں ۔ حادثے کے بارے میں کچھ نہیں لکھا ۔ تم بھی نہ لکھنا ۔ وہ لوگ پریشان ہو جاتے " یہ سوچ کر ہی نہیں اطلاع دی "

سُشیل بچوں کی طرح رو دیا تھا۔ ۔ ۔ "میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گا مکان مالک کرایہ کی عدم ادائیگی کی صورت میں گھر خالی کرانے کی صورت میں گھر خالی کرانے کے پیچھے پڑا ہے۔ میں سال بھر سے کرایہ دے نہیں پایا تھا۔ کہاں سے دیتا؟ گذشتہ سال ماں کی علالت، طویل علالت کے بعد وفات، چھوٹے بچے کی بیماری، ۔ ۔ ۔ ۔ پھر میرا تبادلہ یہاں ہو جانے سے دو گھروں کا خرچ۔ کسی بھی مکان کا کرایہ ادا کرنے کے لیے رقم نہیں پس انداز کر پا رہا تھا کہ مکان مالک نے مکان خالی کرنے کا نوٹس دے دیا۔ میں نے اپنے دوستوں شناساؤں کے سامنے ہاتھ پھیلائے کسی نے میری مدد نہیں کی۔ انہوں نے بھی، جن کی میں نے بروقت میں مدد کی تھی اور انہوں نے بھی جن کا میں نے بھلا نہیں کیا تھا تو برا بھی نہیں کیا تھا۔ اس روز بے انتہا ناامید ہو کر گھر لوٹ رہا تھا کہ وہ حادثہ ہو گیا۔ ۔"

میما کو سُشیل کی کہانی میں کوئی نئی بات نہیں نظر آتی۔ نچلے متوسط طبقے کے افراد کی زندگیوں کی تعریف صرف ایک لفظ محرومی سے کی جا سکتی ہے اس لفظ سے بہتر کوئی دوسرا لفظ نہیں اور اس سے زیادہ جامع تعریف میما کی نظر میں نہیں ہو سکتی تھی ہے۔

سُشیل اور میما کی شناسائی دوستی میں بدل گئی۔ سُشیل باقاعدگی سے میما کے گھر آنے لگا۔ ۔ ۔ دونوں ایک دوسرے کا دکھ سکھ بانٹنے لگے۔

سُشیل اس بات کا رونا ہمیشہ رویا کرتا کہ اس کی شادی اس کی پسند سے نہیں ہوئی۔ والدین نے اپنے پسند کی لڑکی اس کے پلے باندھ دی۔ اسے نباہ کرنا پڑا "کیا تمہاری بیوی تم سے محبت نہیں کرتی؟ کیا وہ تمہارے تئیں وفادار نہیں؟ کیا وہ گھر کی ذمہ داریوں سے واقف نہیں؟ کیا وہ بچوں کی نگہداشت ٹھیک سے نہیں کرتی؟" میما نے سوالات کی بوچھار کر دی۔ "آخر تمہیں کیا شکایت ہے اس سے؟"

سُشیل ایک طویل سانس لے کر بولا تھا "وہ میرے ساتھ نباہ کر رہی ہے یعنی وہ مجھ سے محبت کرتی ہے یا یوں کہہ لیجئے کہ نباہ کرنا ہے اس لیے پیار کرتی ہے پھر اگر آنکھ، کان، ناک اور ہاتھ پاؤں۔ صحیح سلامت ہونا خوبصورتی ہے تو وہ خوبصورت بھی ہے۔ کھانا تیار کرنا اور کھلانا، گھر کا کام اپنے ہاتھوں کرنا سگھڑ پن اور سلیقے کا

منظر ہے تو وہ سگھڑ بھی ہے۔ ۔ ۔ ۔ لیکن ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ،، لیکن کیا؟ رک کیوں گئے ؟ کہو۔ ۔ ۔ ۔ ،، ہیما نے کہا۔

"میں نے ایک شاعر کا دل پایا ہے ہیما جی، کالج کے زمانے سے شاعری کی ابتدا کی تھی۔ میری غزلوں، نظموں کا مرکزی کردار ایک حسینہ ہوا کرتی جس کو میں شریک حیات کے روپ میں تصورات میں دیکھا کرتا۔ ۔ ۔ ۔ انجلی سے شادی ہونے پر میرے خواب ٹوٹ گئے۔ میں نے کوشش کی کہ انجلی میری بیوی اپنے آپ میں وہ خوبیاں پیدا کرلے جو میں چاہتا ہوں۔ یہ نہ کر سکے تو کم از کم میرے اندر کی شاعری کی بے عزتی تو نہ کرے۔ ۔ ۔ مگر انجلی ان معاملات میں بے حس ہے۔ وہ میری نظموں کا مذاق اڑاتی ہے۔ اسے بے کاروں کا دھندا کہتی ہے تنگ آکر میں نے شاعری کرنا چھوڑ دیا تب سے ایک عجیب خالی پن کا شکار ہوں۔ ۔ ۔ ۔ میں اپنے آپ کو گم کر بیٹھا ہوں۔

ہیما کو اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ ایک ایسا دوست ملا تھا جس سے وہ کھل کر بات کر سکتی تھی۔ مگر اس نے اپنی مٹھی کبھی نہ کھلنے دی۔ سشیل کے دکھڑے سن لیتی مگر اپنی ذاتی زندگی کے اسرار پر سے پردہ کبھی نہ اٹھاتی۔ سشیل اپنی ذات کے گرد یوں گھومتا تھا۔ کہ ایک عرصے تک اس نے ہیما کی ذاتی زندگی کی کتاب کے اوراق پر سرسری نگاہ ڈالنے کے سوا کچھ نہ کیا۔

سشیل نے یہ جان کر کہ اس کے پاس مسٹر بھٹ ہیما کے شناسا ہیں، ہیما سے سفارش کروائی تھی اور سینئر گریڈ کلرک بن گیا تھا۔ پھر بھی اس کا مالی پریشانیوں کا رونا کم نہ ہوتا تھا۔ ہیما چاہتی تھی کہ سشیل مالی پریشانیوں سے نجات پالے اور پھر ان دونوں کی بات چیت میں دوسرے موضوع شامل ہوں۔ وہ باتیں کریں ادب کی، سیاست کی سماج، ملک و قوم کی۔ ۔ ۔ ۔ اسی سلسلے میں اس نے ایک دن اس نے سشیل کو آفر دیا تھا "تم کہتے ہو تمہیں گرانٹنگ آتی ہے تم میرے گلابوں کی ذمہ داری سنبھالو۔ بطور نذرانہ مجھ سے ہر ماہ تین سو روپئے لے لیتا۔،،

سشیل مسرور ہو کر بولا تھا۔ ۔ ۔ ۔ شکریہ ہیما جی ۔ ۔ ۔ ۔ شکریہ۔ مگر آپ کے شوہر اعتراض تو نہ کریں گے۔ ۔ ،،

نہیں۔ میرے شوہر مجھ سے حساب نہیں طلب کرتے۔ انہیں مجھ پر اعتماد ہے۔ پھر

میں بزنس میں برابر کی حصہ دار ہوں۔"

مہیما کے دل میں ایک لمحے کے لیے، بس ایک لمحے کے لیے یہ خیال ضرور آیا تھا کہ مرد تنا بھی سُشیل نے یہ نہیں کہا کہ نذرانے کی کیا ضرورت ہے وہ گلابوں کی گرافٹنگ یوں ہی کر دیا کرے گا.... مگر دوسرے ہی لمحے اس نے اپنے دل سے یہ خیال نکال پھینکا. وہ نہایت فراخ دلی تھی۔ ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں کو دل میں جگہ دینا وہ اپنے کردار کے منافی سمجھتی تھی۔... وہ تو ہمیشہ سشیل کو کچھ نہ کچھ دیتی ہی آئی تھی۔ لیا اس سے کچھ نہیں تھا۔

سُشیل تنخواہ ملنے پر اور تیوہاروں پر بیوی بچوں سے ملنے جایا کرتا۔ مہیما اس کی بیوی اور بچوں کے لیے تحائف بھیجتی مگر اس تاکید کے ساتھ کہ اس کا نام درمیان میں نہ آئے۔ پھر بھی فطری تجسس سے اس نے ایک دن پوچھ لیا تھا، "سُشیل تم نے کبھی میرے بارے میں اپنی بیوی کو بتایا ہے؟"

"نا بابا نا" سُشیل نے اپنے کانوں کو ہاتھ لگایا تھا، "آپ میری بیوی کو نہیں جانتیں مہیما جی۔ اسے ذرا سی بھنک بھی مل گئی تو ہمارے سر الزام لگا دے گی۔"

مہیما پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ سر جھکا کر بولی "الزام کیسے لگا دے گی؟ میں شادی شدہ تم بال بچوں والے... کیا یہ کہہ کر تم میری بے عزتی نہیں کر رہے ہو"

ذلت کے احساس اور غصے نے مہیما کے چہرے کی رنگت تبدیل کر دی تو سُشیل نے فوراً پینترہ بدلا تھا، "میرا مطلب یہ تھا مہیما جی کہ انجلی جیسی گنوار عورتیں مرد عورت کے درمیان صرف ایک رشتے کو قبول کرتی ہیں۔ عورت اور مرد دوست بھی ہو سکتے ہیں یہ وہ نہیں سوچ سکتی۔ یہ رشتہ اس کی سمجھ سے برے ہے۔ وہ ایسی جاہل ہے مہیما جی اسے شبہہ بھر ہو جائے میری زندگی حرام کر دے گی۔ آپ میری زندگی ہیں، میرا آئیڈیل ہیں۔ آپ سے میں نے جینا سیکھا ہے، آپ میری روح میں بس چکی ہیں۔"

سُشیل بظاہر انکار کر رہا تھا مگر مہیما جانتی تھی کہ اس کے من میں پاپ ہے۔ مرد کی نظر پہچاننے میں عورت کبھی غلطی نہیں کرتی۔ آنکھوں کی زبان کا ماہر عورت سے بڑھ کر کوئی نہیں ہوتا۔ عقیدت کب ہوس میں بدلتی ہے یہ کوئی عورت سے پوچھے۔

سُشیل اپنی مالی حالت مضبوط کر لینے کے بعد مہیما کی زندگی میں جھانکنے کی کوشش

کرنے لگا۔ ایک دن پوچھ بیٹھا، "میماجی! آپ کے پتی شرد ماتھر کو میں نے یہاں کبھی نہیں دیکھا۔ کیا وہ نہیں آتے؟"

"خطوط آتے رہتے ہیں ان کے۔" میما نے مختصر سا جواب دیا تھا۔

"کیا خطوط کسی کا بدل ثابت ہو سکتے ہیں۔"

"نہیں ہو سکتے ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن کسی نامکمل ہی رہنا ہو تو؟" میما نے لاتعلقی سے کہا تھا۔

"شادی شدہ زندگی، تکمیل کا نام ہے۔ عدم تکمیل کا نہیں۔ اچھا لائیے ماتھر صاحب کی تصویر ہی دکھائیے۔" سنیل نے ضد کی تھی۔

میما بیڈروم میں جا کر ایک فریم لگی تصویر لے آئی تھی "یہ ہیں میرے پتی شرد ماتھر یہ ان کی بیوی رینو اور ان کے بچے بلبش اور گریش۔"

سنیل کے ہاتھ سے فریم چھوٹ پڑا۔ میما نے بے نیازی سے جھک کر فریم اٹھایا۔ اور سنیل کی طرف رخ کر کے ٹیبل پر رکھ دیا ۔ ۔ ۔ "شرد میرے والدین کی پسند تھے ۔ ۔ ۔ شادی ہوئی تب ہم ایک دوسرے کو بے حد چاہتے تھے ۔ ۔ ۔ ایک دوسرے کے بغیر ہمیں زندگی نامکمل لگتی تھی۔ مگر شاید ہم غلطی پر تھے ۔ ۔ ۔ کیونکہ شوہر اور بیوی دو نقطے ہوتے ہیں جو ایک لائن کے ذریعے آپس میں ملتے ہیں۔ یہ لائین یعنی ان کی اولاد ہی انہیں تکمیل عطا کرتی ہے۔ شادی کے بعد کے چار برس کیسے گذرے ہمیں پتہ ہی نہ چلا۔ اس کے بعد شدت سے ہمیں اس بات کی ضرورت محسوس ہونے لگی کہ ہم دو نامکمل نقطوں کو جوڑنے والی لائین اب تک بن جانی چاہیئے تھی۔ ہم ڈاکٹر کے پاس گئے۔ معائنہ کرایا اور میری زندگی کی سب سے تلخ حقیقت اس روز مجھ پر آشکار ہوئی کہ میں اولاد پیدا کرنے کے قابل نہیں ہوں۔ میں ٹوٹ گئی۔ بکھر گئی پھر بھی شرد کی طرف دیکھ کر میں نے خود کو سنبھالا۔ شرد کو بچوں کا بہت ارمان تھا میں نے بچہ گود لینے کی تجویز رکھی۔ شرد نے سوچنے کے لیے وقت مانگا اور کافی غور و خوض کے بعد انہوں نے مسئلے کا حل ڈھونڈا ۔ ۔ ۔ علاحدگی اور پھر طلاق ۔ ۔ ۔ انہوں نے مجھ سے کہا ۔ ۔ ۔ "میما ۔ ۔ ۔ مجھے میری اولاد چاہیئے۔ گود لی ہوئی اولاد سے میں پیار نہ کر سکوں گا ۔ ۔ ۔ یہ وہی شرد تھے جنہوں نے میرے ساتھ جینے مرنے کی قسمیں کھائی تھیں ۔ ۔ ۔ مگر ہونی مجھے تاک چکی تھی۔ میں نے شرد کو تحریر دے دی کہ مجھے

طلاق نہیں چاہیئے۔ وہ بخوشی دوسری شادی کر لیں۔ ’’سُنیل! کیا تم نے کسی ایسے مرد کو دیکھا ہے جو سوتیلے یا غیر بچوں سے نباہ کر گیا ہو۔۔۔۔ نہیں دیکھا ہو گا۔ مگر عورت کو مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے پیٹ کے جایوں کے علاوہ سوتیلے بچوں سے، غیر بچوں سے محبت کرے۔ ہمارے سماج نے کئی باتوں سے مرد عورت کی آزمائش کے مختلف پیمانے بنائے ہیں۔۔،،

کیوں کیا آپ نے ایسا؟ ’’سُنیل طیش میں آکر بولا تھا۔۔۔۔،، آپ نے طلاق لے لینا تھا وہ دوسری شادی کر سکتے ہیں تو کیا آپ نہیں کر سکتیں؟ آپ بے انتہا خوبصورت ہیں۔ آپ کی عمر بھی زیادہ نہیں۔ کوئی بھی شخص آنکھ بند کر کے آپ سے شادی کرنے کو تیار ہو جائے گا۔،،

’’اور میری ماں بن پانے کی نا اہلیت کا علم ہوتے ہی آنکھیں بند کر کے مجھے چھوڑ بھی دے گا۔ پار جس مقصد ہو وہ داؤ کھیلے کیوں؟ ’’سُنیل! ہمارے سماج میں عورت کے لیے سہاگ کا سائبان بے حد ضروری ہوتا ہے۔ تنہا عورت کے پیچھے مرد بھیڑیوں کی طرح لگ جاتے ہیں،،، ’’یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی۔ کیا مستقبل کی باتوں کی آپ کو خبر ہے؟ پھر تمام مرد ایک جیسے نہیں ہوتے؟،،

’’مرد، مرد کی نہیں تو کیا عورت کی طرفداری کرے گا؟ میں تم کو الزام نہیں دیتی۔ پیمانے ہنس کر کہا تھا۔۔۔ ’’آگے کی کہانی سن لو پھر اصرار نہ کرنا۔ زخموں کی کھرنڈ بار بار نوچی جائے گی تو زخم پھر بن گے کیسے؟۔۔۔ شرد کے لیے رینو کو میں نے پسند کیا۔ میں شادی میں بھی شریک رہی۔ ایک سال بعد رینو نے تلیش کو جنم دیا۔ میں نے شرد کو لکھا۔ رینو میرے ساتھ رہے مجھے اعتراض نہ ہو گا۔ شرد کا ایک سطری جواب آیا۔۔۔ رینو کو اعتراض ہے،، اس روز کے بعد میں نے شرد کو بھی یہاں آنے کی ممانعت کر دی۔ ان کے خطوط آتے رہتے تھے۔ انہوں نے یہ بنگلہ میرے نام لکھ دیا۔ بزنس میں میرا حصہ پہلے سے تھا۔ سچ کہتی ہوں سُنیل! اب تو خدا پر سے بھی میرا بھروسہ اٹھ گیا ہے یقین جانو میرے بس میں کسی کو کچھ دینا ہوتا۔ اور وہ دن رات میرے سامنے ہاتھ باندھے کھڑا رہتا تو میں اسے مایوس نہ کرتی۔۔۔ لیکن میرا خدا ایسا نہ کر سکا۔ ساری کائنات کا بادشاہ مجھ فقیر کو بامراد نہ کر سکا

ہیما بڑی خوبی سے اپنے آنسوؤں کا گلا گھونٹ رہی تھی۔ سُنیل نے پوچھا۔۔۔
خط آتے رہتے تھے، کا کیا مطلب؟ کیا اب ان کے خط نہیں آتے؟"

"۔۔میں نے خط لکھنے کے لیے بھی ان کو منع کر دیا۔ آٹھ ماہ پہلے کی بات ہے۔ ایک خط میں شرد نے لکھا ہیما، میں نے تمہارے بڑے بھائی سے بات کی ہے۔ وہ اپنا نوزائیدہ بچہ تمہیں گود دینے کے لیے تیار ہیں۔ تمہاری خواہش بھی تھی۔۔۔۔ لے لو۔۔۔"
میں نے جواب لکھا۔۔ میں نے یہ خواہش ظاہر کی تھی تب میں بیوی تھی، گھر کی مالکن تھی۔۔۔
میرا گھر تھا جہاں میں بچے کی کلکاری سننا چاہتی تھی۔ تم نے مجھ سے علاحدگی اختیار کر لی۔ مجھے شریک حیات کے حقوق سے محروم کر دیا۔۔۔ میرے گھر کو مکان بنا دیا اینٹوں پتھروں کا مکان، جس میں شوہر نہیں وہ گھر عورت کے لیے بے وقعت ہے۔ اب میں اولاد لے کر کیا کروں گی؟ چڑا چڑیا مل کر گھونسلہ بناتے ہیں کبھی کسی تنہا چڑیا کو آشیاں کے لیے تنکے جمع کرتے دیکھا ہے؟ تمہیں مجھ پر رحم کھانے کا کوئی حق نہیں۔۔۔۔ خط میں ایسی ہی باتیں لکھی ہوں تو آئندہ مجھے خط بھی نہ لکھنا۔"

"انہوں نے خط لکھنا بند بھلے ہی کر دیا ہو مگر کیا وہ آپ کے بارے میں خبر نہ رکھتے ہوں گے۔۔۔۔ مثلاً یہ کہ آپ خود کو کس طرح مشغول رکھتی ہیں؟ کون کون آپ کے گھر آتا ہے؟ آپ کس سے ملتی ہیں کس سے نہیں؟" سُنیل نے معنی خیز نظروں سے دیکھ کر پوچھا تھا۔

میں سمجھ رہی ہوں کہ تم کیا کہنا چاہتے ہو؟" ہیما نے طویل سانس لے کر کہا تھا
"وہ مجھے خوب جانتے ہیں کہ مرد وزن کے جسمانی تعلقات میرے لیے بے معنی ہو چکے ہیں۔۔۔۔ کیونکہ جب میں نے اس بات کو سمجھ لیا کہ جسمانی تعلقات کا دل کے جذبات سے کوئی تعلق نہیں، وہ دنیاوی سکون کے حصول کا ذریعہ ہوتے ہیں تو میں نے اس کی بے حقیقتی سے واقف ہو کر خود کو اس سے دور کر لیا۔۔۔۔ ان تعلقات سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔۔"

سُنیل سمجھتا تھا کہ مالی مشکلات ہی زندگی میں سب سے زیادہ دکھ پہنچاتی ہیں۔ اور اسی وجہ سے وہ آپ کو بڑا دکھیارا سمجھتا تھا۔ مگر ہیما کی زندگی کے حالات جاننے اور اس کی محرومی سے واقفیت کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ دکھ کی محدود الفاظ میں

تعریف نہیں کی جاسکتی۔ زندگی کے مختلف ادوار میں، سماجی نظام کے ہر طبقے میں ..... مرد و عورت کی انفرادی زندگیوں میں وہ مختلف شکلوں میں داخل ہوتا ہے۔

"کہاں کھو گئیں آپ؟" انجلی نے اس کے سامنے بیٹھ کر پکارا تو میہا پرانی یادوں کے حصار سے باہر نکل آئی..... اس کی زندگی کے حالات سے واقف ہونے کے بعد سُنیل کی آنکھوں میں کچھ نئی مانگیں جاگنے لگی تھیں۔ خطرناک تقاضے سایے پھیلانے لگے تھے جس سے گھبرا کر وہ ناگپور سے یہاں انجلی سے ملنے چلی آئی تھی۔

"پوچھیے کیا پوچھنا چاہتی ہیں آپ؟" انجلی مجسم جواب بنی بیٹھی تھی۔

میہا نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا "آج مردوں میں، دوسری بیوی یا دوسری عورت رکھنے کا فیشن سا چل پڑا ہے۔ اس کے کئی اسباب ہو سکتے ہیں۔ جیسے یہ کہ بیوی، شوہر کے آدرش پر پوری نہ اترتی ہو، یا شوہر کے تئیں اپنے فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی کرتی ہو..... یہ بھی ہو سکتا ہے کہ شوہر صرف اپنی اہمیت جتانے کے لیے بطور فیشن دوسری عورت رکھ لے..... عیاش طبع مرد عیاشی کے لیے بھی عورت رکھ سکتے ہیں..... میں نے اپنے سروے میں پہلے، یا یوں کہئے کہ پہلے اور دوسرے اسباب کو زیر بحث رکھا ہے۔ یعنی میرا کہنا ہے کہ شوہر کے کسی دوسری عورت کی طرف متوجہ ہونے کا سبب خود بیوی بنتی ہے۔ آپ کیا کہتی ہیں اس بارے میں؟"

"وہ عورت کیوں کسی کے شوہر پر ڈورے ڈالتی ہے؟" انجلی نے برجستہ کہا تو میہا کو حیرت ہوئی۔ وہ اتنی کوڑھ مغز نہیں لگتی تھی جتنا سُنیل اسے سمجھتا تھا۔ "یہ ایک الگ سوال ہے" میہا نے کہا، "شوہر گھر سے باہر جاتا ہے۔ بہت ساری عورتوں سے ملنا جلنا ہے۔ ان سے مل کر اسے عورتوں کے بہت سے ایسے اوصاف سے واقفیت ہوتی ہے جو اس کی بیوی میں موجود نہیں ہوتے۔ وہ اپنی بیوی کو آدرش بیوی بنانا چاہتا ہے۔ بیوی ساتھ نہیں دیتی۔ ایسے حالات میں کئی دوسری عورت کی طرف متوجہ ہو جانا فطری ہے..... میہا چند لمحوں کے لیے رکی پھر مسکراتی ہوئی بولی "ہو سکتا ہے کہ آپ یہ سوال اٹھائیں کہ آج کے زمانے میں عورت بھی باہر کام کرنے جاتی ہے۔ اس کے ساتھ بھی یہی واقعات پیش آ سکتے ہیں۔ تب کیا شوہر اسے دوسرے مرد کو اپنا لینے کی اجازت دے سکتا ہے؟ میں پھر کہوں گی کہ یہ بھی ایک الگ موضوع ہے

ہمارے سماج کا ڈھانچہ ایسا ہے جہاں مرد ابھی بھی آزادی اور حقوق کا زیادہ فیصد میں فائدہ اٹھا رہا ہے.... میری بات آپ کی سمجھ میں آ رہی ہے؟"

"سمجھ رہی ہوں مگر آپ نے انٹرویو کے لیے میرا انتخاب کیوں کیا کہ یہ میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے" انجلی کشمکش و پیچ میں مبتلا تھی۔

"مجھے اپنے سوال کا جواب آپ ہی سے ملے گا...." میرا مطلب ہے ایک گھریلو خاتون ہی سے ملے گا" مہیما نے بات بنائی.... کیونکہ میری معلومات کے مطابق آپ کے پتی ناگپور میں ملازمت کرتے ہیں۔ فرض کیجئے کبھی ایسا ہو... کہ وہ کسی دوسری عورت کی طرف متوجہ ہو جائیں تو اس کا کیا سبب ہو گا۔"

انجلی کھلکھلا کر ہنس پڑی "آپ میری پتی کو نہیں جانتیں؟ جانتیں ہوتیں تو کبھی ایسا نہ کہتیں۔ وہ مجھ سے اپنے بچوں سے بے انتہا پیار کرتے ہیں.... مجبوری ہے کہ دور رہ رہے ہیں مگر میں یہ خوب جانتی ہوں کہ ان کی زندگی میں میں ہی میں ہوں کوئی دوسری عورت نہیں ہے..."

انجلی کے اعتماد نے مہیما کو متزلزل کر دیا۔ تمام احتیاط کو بالائے طاق رکھ کر کہہ بیٹھی "مگر میری اطلاعات کے مطابق وہاں ان کے کسی عورت سے بے حد گہرے تعلقات ہیں"۔ "آپ پوچھ سکتی ہیں کہ مجھے یہ بات کیسے معلوم ہوئی تو آپ جانتی ہیں ہم نامہ نگاروں کو اپنے اطراف کی خبریں رکھنی پڑتی ہیں.."

انجلی نے مہیما کی صفائی پر دھیان نہ دیتے ہوئے کہا "تعلقات نہیں، محض جان پہچان کہیے۔ آپ مہیما ماتھر کی بات کر رہی ہیں کیا؟"

مہیما کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا.... خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولی "آپ مہیما ماتھر سے واقف ہیں"۔

"ہاں میرے پتی نے مجھے ان کے بارے میں بتایا ہے۔ وہ مجھ سے کوئی بات نہیں چھپاتے.."

"کیا بتایا ہے انہوں نے آپ کو؟" ڈوبتے دل سے مہیما نے دریافت کیا۔ اسے اچھی طرح یاد تھا۔ سنیل نے انجلی کے شکی مزاج کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا "وہ آپ کے بارے میں نہیں جانتی۔ انجلی کہہ رہی تھی — "انہوں نے میری پتی پر بہت احسان کیے

کئے ہیں، ہمیں مالی مشکلات سے نجات دلائی ہے۔ میرے پتی کی ترقی کرائی ہے۔ اپنے گھر کے باغ کا کام دیا ہے.... میرے پتی نے مجھے تمام باتیں تفصیل سے بتا کر کہا تھا انجو، لوگوں کے بہکاوے میں آکر کبھی مجھے غلط نہ سمجھنا، میما ماتھر عورت نہیں دیوی ہے... وہ رک گئی پھر اچانک ہنس کر بولی۔

"سچی وہ عورت ہے بھی نہیں....."

میما نے بڑی مشکل سے اپنے آپ کو سنبھالا... بولی چلئے، بات ہی ختم ہو گئی، وہ آپ کے پتی کی زندگی میں آنے والی دوسری عورت نہیں ہے.... لیکن آپ نے ابھی یہ کیا کہا کہ وہ عورت ہے ہی نہیں، اس کی وضاحت کریں گی آپ؟"

انجلی پھر ہنسی... "میرے پتی کہتے ہیں عورت وہ ہے جو پتی کو اولاد دے عورت وہ ہے جو پتی کے دکھ سکھ میں اس کا ساتھ دے، میما میں یہ دونوں اوصاف نہیں ہیں۔"

"اچھا اب میں چلوں گی" میما اچانک اٹھ کر کھڑی ہو گئی "ایک بات کہوں گی کہ اپنے پتی سے اس ملاقات کا ذکر نہ کیجئے گا۔"

"آپ کہتی نہیں تب بھی میں ان سے کہتی، ایسے کسی کے بھی کہنے میں آکر میں اپنے پتی پر شک کرنے لگوں تو، چل چکی میری گرہستی۔"

میما انجلی کے پاس چلی تو اس کے دماغ میں آندھیاں چل رہی تھیں۔ اس کی ڈائری کے پہلے ورق پر سشیل نے ایک مرتبہ لکھا تھا خاموش زندگی جو بسر کر رہے ہیں ہم، گہرے سمندروں میں سفر کر رہے ہیں ہم۔"

ٹیکسی سے اسٹیشن تک اور ریل سے اپنے گھر واپس پہنچنے تک اسے یہی محسوس ہو رہا تھا کہ وہ ایک گہرے سمندر میں ڈوبتی چلی جا رہی ہے جہاں کنارے پر سشیل کھڑا اسے پکار رہا ہے۔ میما جی، میں آپ سے آپ کو مانگتا ہوں، میں آپ سے آپ کو مانگتا ہوں" اسٹیشن پر اتر کر پارکنگ سے اپنی کار نکالنے تک وہ اسی حالت میں تھی۔ انجلی کی باتیں رہ رہ کر دماغ میں چکر لگا رہی تھیں، مگر میما کو پورا یقین تھا کہ اس نے سشیل کو سمجھنے میں غلطی نہیں کی تھی، اس نے صاف الفاظ میں خواہش ظاہر کی تھی.... وہ سمجھ نہ جانتی تو کیوں یہ انتہائی اقدام اٹھاتی۔ سشیل کو سمجھانے کے لیے انجلی کو حالات سے واقف

کرانے کیوں جاتی ؟ انجلی سے یہ کیوں کہنا چاہتی کہ اپنے سہاگ کی حفاظت کرنی مقصود ہو تو سُشیل کے باس سے مل کر اس کا تبادلہ اپنے شہر کرا لو۔۔۔۔، کتنا بڑا دھوکہ ہوا اس کے ساتھ۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ سُشیل نادانی میں دو دو کشتیوں میں پاؤں رکھنا چاہ رہا ہے۔۔۔۔ انجانے میں بازی کھیل رہا ہے۔۔۔ مگر انجلی سے مل کر اسے پتہ چلا کہ سُشیل خوب سوچ سمجھ کر بازی کھیل رہا تھا۔۔۔ اسے بچانے کی آڑ میں ڈبو دینے کی سازش کر رہا تھا۔

گھر جانے کی بجائے وہ اپنی کار سیدھی سُشیل کے باس کے بنگلے پر لے گئی۔۔۔

"ہیلو مسز ماتھر!" انہوں نے اس کا استقبال کیا۔ وہ لان پر ہی موجود تھے "کہیے کیسے زحمت کی ہے؟"

"بھٹ صاحب! آپ سُشیل ماتھر کا تبادلہ اس کے اپنے شہر میں کر دیں۔ کل آرڈر دے کر کل ہی ریلیف کر دیں۔ میں آپ کی ممنون ہوں گی" کہتی ہوئی وہ کار میں جا بیٹھی۔ وہ جانتی تھی دیرینہ تعلقات کی بنا پر بھٹ صاحب اس کی خواہش کا ضرور احترام کریں گے۔

گھر کی طرف لوٹتے ہوئے میما کا من اب شانت تھا۔ گہرے سمندر جیسا شانت اور پرسکون!۔

گہرے سمندر کا سفر
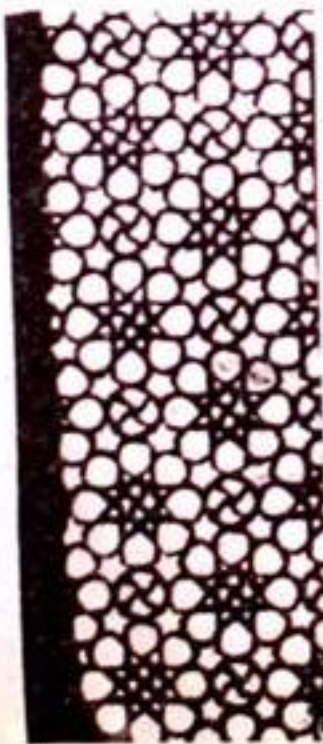
دو گھنٹے سے پلیٹ فارم پر بیٹھا بیٹھا میں بور ہو رہا تھا۔ وہ تو کافی دیر بعد آئے شاید انہوں نے پہلے پتہ کر لیا تھا کہ ٹرین اپنے مقررہ وقت سے تین گھنٹہ لیٹ چلے گی.

میرے پاس میرے اپنے اٹیچی کیس کے علاوہ ایک بہت بڑا بکسا تھا جسے لے کر گھومنا میرے بس سے باہر تھا ورنہ یوں خالی بیٹھا بیٹھا مرجانے کی حد تک نہ اکتا جاتا تھا میں اسٹیشن سے باہر نکل کر ایک کپ چائے پی آتا، کچھ کھا آتا یا سگریٹ ہی خرید لاتا۔ بک اسٹال کے اردو، انگریزی، ہندی رسائل پر نظریں دوڑا لیتا۔ ریلوے ٹائم ٹیبل میں سے تمام آنے جانے والی گاڑیوں کے نام اور اوقات یاد کر لیتا... کچھ کرتا ضرور۔ یوں عورتوں کی طرح بکسے پہ بیٹھ کر دل ہی دل میں کڑھتا نہ رہتا.

پلیٹ فارم پر ہمیشہ کی طرح گہما گہمی تھی. لگتا تھا کہ ہر کوئی کہیں جانے کو بے قرار ہے یا کہیں سے آیا ہوا ہے۔ ہر شخص اکتایا ہوا نظر آتا تھا خصوصاً عورتیں بہت ہی بے زار نظر آ رہی تھیں۔ مزاج مزاج کی بات ہے عورتیں عموماً جلد ہی ناراض ہو جاتی ہیں.....

ٹرین لیٹ چل رہی ہے تو یوں چل رہی ہے اسٹاف کیا کرتا رہتا ہے؟ ٹرین میں بیٹ

نہیں مل رہی ہے تو کیوں؟ زائد ڈبے بلکہ ضرورت کے مطابق ڈبے کیوں نہیں لگاتے ریلوے والے۔ بس اسی طرح کی جھنجھلاہٹیں۔ بچے بھاگ دوڑ رہے تھے.... کچھ بیٹھے اونگھ رہے تھے.... چند اشخاص ایسے بھی تھے جو قطار میں نہ کھڑے ہو کر اپنے کسی نمائندے کو یہ ذمہ داری سونپ کر قلیوں سے یا قلیوں کے توسط سے ڈیوٹی پر تعینات سپاہیوں سے جگہ حاصل کرنے کے لیے گٹھ جوڑ کرنے میں لگے ہوئے تھے۔

یوں دیکھا جائے تو اچھی خاصی لمبی ٹرین نظر آتی ہے مگر بغیر ریزرویشن کے چلنے والوں کے لیے صرف دو ڈبے ہوتے ہیں.... جنرل ڈبے دو اور ان میں سوار ہونے والوں کی قطار شیطان کی آنت سے بھی لمبی۔ اب جناب ریزرویشن ہر کوئی کرا نہیں سکتا، بزنس میٹنگ کانفرنس، بیماری، موت، پیدائش وغیرہ پچاسوں کاموں سے آدمی ایک مقام سے دوسرے مقام پر جاتا ہے.... وہ وہاں اپنے کاموں کو نپٹائے گا کہ گھنٹوں قطار میں لگ کر ریزرویشن کرائے گا۔ چلو میٹنگ کانفرنس کی بات چھوڑ دیں، وہاں یہ رہتا ہے کہ کب لوٹنے کو ملے گا۔ مگر کسی کی عیادت کو جانے والے کو کیا پتہ کہ وہ بیماری سے شفا پائے گا یا جنت کی ٹکٹ کٹائے گا۔ کوئی یہ نہیں سوچتا کہ یہ کل تک مر جائے گا تو پرسوں نکل چلیں گے۔ چلو ریزرویشن کرالیں۔ ریزرویشن وہ کراتے ہیں جنہیں فرصت ہوتی ہے، جن کے پاس ریزرویشن کروانے کے لیے آدمی ہوتے ہیں.... یا وسیلہ ہوتا ہے.... ایک ماہ بعد فلاں مقام پر جانا ہے.... وہاں سے ٹھیک پندرھویں دن لوٹنا ہے۔ گرمیوں میں پہاڑ جانا ہے سردیوں میں کہیں اور، پروگرام طے ہوتا ہے۔ آرام کے عادی ہوتے ہیں۔ آرام سے سفر کرتے ہیں۔

پھر جگر بھی ہونا چاہیے۔ جنرل ڈبے میں پیش آنے والی مشکلات کا سامنا کرنے کا۔ عام آدمی کو دیکھو ایک اٹیچی ہاتھ میں اٹھائے ہندوستان کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک بھاگتا رہتا ہے۔ دن کے اوقات میں اپنے کام نپٹاتا ہے رات کو جنرل ڈبے میں سفر کرتا ہے، بیٹھنے کی جگہ مل گئی تو قسمت پر ناز کرتا اور خدا کا شکر ادا کرتا ہے ورنہ پاؤں ٹکانے بھر کی جگہ تو کہیں گئی نہیں۔ رات کھڑے کھڑے بھی گذاری جا سکتی ہے اگر گذارنا چاہیں۔

چند خوش قسمت ایسے بھی نظر آتے ہیں جنہیں جنرل ڈبے میں بھی پاؤں پھیلا کر

سونے کا زریں موقع مل جاتا ہے۔ وہ جن کے جسم پر وردی، سر پر کیپ، کندھے پر بندوق اور چہرے پر رعب ہوتا ہے انہیں برتھ پر قبضہ جمانے میں کبھی ناکامی کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ کندھے پر بندوق چاہے نہ ہو، چہرے پر اکڑ، آواز میں گرج اور انداز میں ڈھٹائی ہو تب بھی کامیابی کے سو فیصد امکانات ہوتے ہیں۔

ٹرین کے پلیٹ فارم پر آتے ہی وہ شور مچتا ہے، نفسا نفسی کا وہ عالم ہوتا ہے کہ کیا قیامت میں ہوگا۔ سب کے سب ٹرین کی طرف ایسے بھاگتے ہیں جیسے سیٹی بجنے پر ریس کے گھوڑے منزل کی طرف بگٹٹ بھاگتے ہیں۔ جو کوئی پہلے اندر پہنچتا ہے چاہے دروازے، چاہے کھڑکی سے، وہ سیٹ پر انگوچھا، چادر...... اٹیچی رکھ کر ضرورت سے زیادہ جگہ گھیر لیتا ہے ضرورت سے زیادہ اس لیے کہ بعد میں سیٹ آفر کرکے کسی پر احسان لادا جا سکتا ہے۔ اندر کے اندر رہے، باہر سے جنت نہ گئی۔

خالی ٹرین میں لوکو شیڈ سے سپاہی بیٹھ کر آتے ہیں۔ ٹرین کے پلیٹ فارم پر لگ جانے کے بعد ہی اندر سے دروازہ کھولتے ہیں۔ باہر والے سپاہی اشارے سے سمجھا دیتے ہیں، اندر والے اتنی سیٹیں روک لیتے ہیں۔ پہلے یہ کام قلی کیا کرتے تھے۔ بہت لاقانونیت چلتی تھی۔ آج کل پولیس والے یہ فرض نبھاتے ہیں اور اب یہ پولیس انتظام کہلاتا ہے۔

گھنٹوں سے جس قطار کو بنائے رکھنے کے لیے سپاہی کوشاں رہتے ہیں ڈنڈے بجا بجا کر قطار درست کرتے رہتے ہیں وہ قطار ٹرین کے آتے ہی ایسے منتشر ہوتی ہے جیسے نماز پڑھتے ہی جیو نمبوا کی قطار منتشر ہو جاتی ہے۔ کوئی بھی قطار میں آگے نہیں بڑھتا، جو بڑھ سکتا ہے، دوسروں کو دھکا دے کر آگے بڑھ سکتا ہے وہ ٹرین میں چڑھ جاتا ہے باقی سب پیچھے رہ جاتے ہیں سپاہی بھی اپنے اپنے والوں کو سیٹ دلانے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ عوام کے آرام و آسائش کا خیال رکھنا ان کا فرض جو ٹھہرا۔

ایک سیٹ کا دام بیس سے چالیس روپئے تک ہوتا ہے۔ دام کی کمی بیشی بہت سی باتوں پر منحصر ہوتی ہے۔ جیسے مسافر سیٹ حاصل کرنے کے لیے کس حد تک جا سکتا ہے؟ تنہا ہے یا بیوی بچوں کو ہمراہ لیے ہے۔ موٹی مرغی ہے یا کنجوس مارواڑی ہے؟... جہاں زیادہ قلی سب سوچ کر سمجھ ہی معاملہ طے کرتے ہیں۔ چالیس روپیہ صاحب!

ہاں ہاں ساب ایک سیٹ کا۔ جلدی بولو۔ نہیں تو پنجر کی کمی نہیں۔ بہت ملتے ہیں۔
مسافر بھاؤ تاؤ کرتا ہے۔ قلی کہتا ہے ٹیم خراب مت کرو ساب۔ ہم کیا اکیلا کھانے مانگتا ہے۔ سپاہی ہے، ہے انچارج صاحب ہیں۔۔۔۔ نہیں پٹتا تو جانے دیو۔ مسافر کے نرم پڑتے ہی اس کا دل رکھنے کو یا اپنا بڑپن جتانے کو قلی پانچ دس روپئے کم کر دیتا ہے۔ ٹھیک ہے تیس روپیئے ساب، چھوٹا موٹا سامان لے کر ایک آدمی ہمارے ساتھ آ جائے ہم سے بات نہیں کرنا۔۔۔۔ ہمارے پیچھے پیچھے آنا۔ ہم سے بات کرے گا تو دوسرا سپاہی شک کرے گا۔۔۔۔ ہم آنکھ سے اشارہ کرے گا تو سمجھ جانا۔ گھس پڑنا ڈبے میں۔۔۔۔
کتنے ہی مسافر سے قطار نکل کر قلیوں کے پیچھے پلیٹ فارم کے دوسرے سرے پر جا رہے تھے۔ دن دہاڑے قلی چھلاوے کی طرح مسافروں کو بہکا کر لے جا رہے تھے دیکھا جائے تو سیٹ حاصل کرنے کے تعلق سے آج میں بھی فکر مند تھا۔ ٹرین آج ہمیشہ سے کچھ زیادہ بھرا ہوا تھا اور میرے پاس تھا وزنی بکسا۔ اپنا ایک اٹیچی بھر ہوتا تو میں تنہا بہت آسانی سے ٹرین میں چڑھ جاتا اور سیٹ بھی حاصل کر لیتا مگر یہ بکسا! نانی سے ملنے گیا تو انہوں نے بکسا حوالہ کر دیا کہ چھوٹی خالہ کو پہنچا دینا۔ پتہ نہیں کیا اینٹ پتھر بھر کر دیئے تھے کہ اسے اٹھا کر ٹرین میں چڑھنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور تھا۔ میں کوئی ہیلتھ سپلائی نہیں اچھا خاصا صحت مند نوجوان ہوں۔ نہایت پھرتیلا بھی۔۔۔۔ مگر اس میدان میں فتح یاب ہونے کے لئے ڈھٹائی کی زیادہ اہمیت ہے۔ میں سر جھکا کر تسلیم کرتا ہوں کہ مجھ میں یہ خوبی (خرابی) نہیں ہے۔
گذشتہ بار کے سفر میں ایک موٹی پنجابی عورت کی خستہ حالت کا واقعہ مجھے یاد آیا۔ جنرل ڈبے کا دروازہ اندر سے کھلتے ہی وہ سب سے پہلے دروازے تک پہنچی تھی۔ ایک پاؤں اوپر رکھا بھی تھا۔ دوسرے پاؤں پر جسم کا وزن سنبھال ہی رہی تھی کہ کسی دل جلے نے کمرے کے پیچھے دونوں ہاتھ لگا کر اسے اناج کی بوری طرح اندر دھکیل دیا تھا۔ بڑا ہی مضحکہ خیز منظر تھا۔ کہاں تو بھگدڑ میں دو دو اشخاص ایک ساتھ دروازے سے گذر جاتے ہیں اور کہاں اس تنہا عورت نے دروازہ بلاک کر دیا تھا۔ گھسنے والوں کی بے صبری بجا تھی۔ اپنی اپنی سیٹ پر قبضہ کر لینے کے بعد اس مضحکہ خیز سچویشن کو دہرا کر خوب ہی قہقہے لگائے گئے تھے۔ موٹی عورتوں کے لطیفے سنانے میں ہنسی بھی تھا۔

قطار میں میرے پیچھے ایک ادھیڑ عمر کا بیوپاری تھا۔ چند لمحوں پہلے ہی میں اسے قلی سے بات کرتا دیکھ چکا تھا۔ ظاہر ہے پیار محبت کی باتیں نہ ہوئی ہوں گی۔ میں نے دریافت کیا "کیوں سائیں" کتنا مانگتا تھا؟"

بیوپاری نے چونک کر مجھے دیکھا۔ کہا "بیس روپئے۔ اندھیر ہے اندھیر! اپن کو ہفتے میں دو بار بمبئی آنا پڑتا ہے۔ ہر ٹیم بیس روپئے دے کر سیٹ لے گا تو ہوگیا بنٹا ڈھار! وہ تو بے بار ہم دو اُٹھارات سویا نہیں۔ اس واسطے سوچا رات کو تھوڑا نیند ہوجائے تو اچھا۔۔۔ پر بیس روپیہ پھوکٹ کا نہیں ہے ہمارے پاس!" "سنو سائیں" تم سیٹ کی بات طے کرلو۔ تھوڑے صحت مند ہو (یہاں میں نے جان بوجھ کر تھوڑا کہا ورنہ بیوپاری تھوڑا نہیں بہت زیادہ صحت مند تھا) کچھ پھیل کر ہی بیٹھنا۔ مجھے اپنے پاس جگہ دے دینا۔ میں تمہیں دس روپئے دوں گا۔"

پکا بیوپاری تھا سائیں! بولا "نہیں، بیس روپئے دینا۔ قلی کو بتاؤں گا۔ میں جگہ دوں گا میں۔ تم کیا کروگے؟"

مجھے بڑا غصہ آیا۔ کچھ نہ کہہ کر میں نے اس کی طرف سے منھ پھیر لیا اور بس اسی وقت وہ نظر آئی۔ وہ! جس کا ذکر میں نے کہانی کے آغاز میں کیا تھا۔

شاید انہوں نے پہلے پتہ کرلیا تھا کہ ٹرین مقررہ وقت سے تین گھنٹہ لیٹ چلے گی۔۔۔۔ یا انہیں پہنچتے پہنچتے دیر ہوگئی تھی۔۔۔۔ یا انہوں نے سفر کا پروگرام وقت پر بنایا تھا۔۔۔۔ جو بھی ہو۔۔۔۔ وہ پلیٹ فارم پر ٹرین کے انتظار کی کوفت سے بچ گئے تھے۔

دونوں میاں بیوی لگ رہے تھے۔ بعد از اں یہ ثابت ہوگیا کیونکہ دونوں بات بات پر لڑ رہے تھے۔ شوہر ہوگا چالیس کے آس پاس کا۔ بیوی بیس تئیس کی۔ لگتی اس سے بھی کم عمر تھی۔ نیلے رنگ کی ساڑی اور بلاؤز اور اسی رنگ سے میچ کرتے اونچی ایڑی کے سینڈل پہنے تھی۔۔۔۔ آہستہ آہستہ نشہ طاری کرنے والا حسن تھا اس کا۔ میں نے دیکھا اور دیکھتا ہی رہ گیا۔ ایک انجانی کشش سے کھنچا میں اس کی طرف بڑھ چلا۔ موٹے بیوپاری سے کہتا گیا کہ قطار آگے بڑھے تو میرا بکسا آگے کھسکا دینا۔ میں اس حسینہ کو قریب سے دیکھنا چاہتا ہوں۔۔۔۔ اس کے قریب پہنچ کر میں نے ایک سگریٹ سلگائی اور

اُسے گھورنے لگا۔

غضب کی سیکس اپیل تھی اس میں، میری طرح اور کئی نوجوان اسے گھور رہے تھے پلیٹ فارم پر حسین چہروں کی کمی نہ تھی مگر وہ بے مثال تھی۔ لافانی تھا حسن اس کا ستاروں کے جھرمٹ میں چاندسی چمک رہی تھی وہ۔

جنرل ڈبے میں چڑھنے کے لیے تیار مسافروں کی لمبی قطار دیکھ کر وہ فکر مند ہو کر بولی "ایسے میں کیا جگہ ہمیں ملے گی؟"

"میں تو پہلے ہی کہہ رہا تھا مگر تم کسی کی سنو تب نا" شوہر تلخ لہجے میں بولا۔۔۔ "بھگتیں گے اب، اور کیا کریں گے؟"

اتنا کہہ کر شوہر اپنے ساتھ کھڑے ہوئے شخص سے باتیں کرنے لگا اپمان سے بیوی کا چہرہ لال ہو گیا۔ شوہر کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولی، "کسی قلی سے بات کیوں نہیں کرتے؟ دیکھو کچھ لے کر سیٹ دلا دے تو؟"

شوہر کچھ بولے بغیر قطار سے نکل کر ایک طرف چلا گیا۔ ایک قلی سے بات کی، اور لوٹ آیا۔

"کیوں؟ کیا ہوا؟" بیوی نے بے صبری سے پوچھا۔

"بات نہیں بنی، تم ایسا کرو زنانہ ڈبے میں بیٹھ جانا۔"

"نہیں میں زنانہ ڈبے میں نہیں بیٹھوں گی" بیوی نے سختی سے انکار کیا۔

"وہاں بھیڑ کم ہوتی ہے جگہ ملنے کا امکان ہے دوسرے ڈبوں میں جگہ نہ ملے گی" شوہر نے خبردار کرتے ہوئے کہا۔

"نہ ملے۔ کھڑی رہوں گی مگر زنانہ ڈبے میں نہیں بیٹھوں گی" بیوی نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ آس پاس کے لوگ انہیں پلٹ پلٹ کر دیکھنے لگے۔

"مجھے عورتوں سے ڈر لگتا ہے۔ وہ کچھ کھلا دیتی ہیں، جادو ٹونا کر دیتی ہیں"

"کیا بچپنے کی باتیں کرتی ہو" شوہر تیزی سے بولا، "جنرل ڈبے میں جگہ نہ ملے تو رونا نہیں، بسورنا نہیں۔ تمہاری ضد کی وجہ سے یہ دھکے کھانے پڑ رہے ہیں۔

اسی وقت ایک قلی آکر شوہر کو اشارے سے بلا لے گیا، شاید وہی تھا جس سے پہلے اس نے بات کی تھی۔ دو منٹ کے بعد شوہر واپس آکر بولا۔

"تم یہ اٹیچی لے کر اس کے ساتھ جاؤ۔"

"اکیلے؟" وہ جھجکی۔

"جاؤ بھی! یہاں بھری بھیڑ میں وہ تمہیں کھا نہ جائے گا۔" شوہر جھنجلا گیا "سیٹ دلانے لے جا رہا ہے۔ تمہیں بٹھا کر مجھے لینے آئے گا۔"

"کتنے روپئے لے گا؟" بیوی نے پوچھا۔

"چالیس!" شوہر نے اکتاہٹ سے کہا۔

"ایک سیٹ کے؟" بیوی کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔

"ہاں!" شوہر کا چہرہ اب بھی جذبات سے خالی تھا۔

"یہ تو بہت ہوئے۔"

جھک جھک نہ کرو۔ سیٹ نہ ملنے کا خدشہ تمہاری بھی کڑکڑا رہی تھی۔ اب سیٹ مل رہی ہے تو آ گا پیچھا دیکھنے بیٹھی ہو۔ کھڑے کھڑے تم سفر نہ کر سکو گی۔ فرش پر بیٹھنے میں تمہیں شرم آئے گی۔ . . . پھر فضول ہی میرا بھیجا کھاؤ گی۔ اب جاؤ بھی۔ ٹرین پلیٹ فارم پر آنے والی ہے۔ شوہر نے آخری جملہ ڈانٹنے والے الفاظ میں کہا۔

ایک اٹیچی اٹھا کر تیز تیز قدموں سے وہ قلی کے پیچھے چلی گئی۔ میں اپنے سامان کے پاس پہنچا ہی تھا کہ ٹرین کی آمد کا غلغلہ بلند ہوا۔ بھگدڑ مچ گئی۔ میں نے قلی کے سر پر بکسا رکھوایا اور بھگدڑ میں شامل ہو گیا۔ نیلی ساڑی پر نظریں جمائے تھا۔ ایک جھلک جس ڈبے کے دروازے پر دیکھی اسی میں دوسرے دروازے سے داخل ہو گیا۔ تھوڑی جگہ دیکھ کر قلی بکسا رکھنا چاہتا تھا۔ میں نے منع کر دیا اور مسافروں کو دھکیلتا ہوا آگے بڑھتا گیا۔ آخرکار وہ دکھائی دے گئی۔ کھڑکی کے قریب کی ایک تنہا سیٹ پر بیٹھی سامنے والی سیٹ کو پاؤں رکھ کر روکے ہوئے تھی۔

آس پاس کوئی سیٹ خالی نہ تھی پھر بھی میں نے بکسا اتروا لیا۔ قلی کو اجرت دے کر رخصت کرنے کے بعد سیٹ کی تلاش میں ادھر ادھر دیکھا ہی تھا کہ وہ موٹا ہوپارکے دکھائی دے گیا۔ نہ جانے کس طرح مجھ سے پہلے اندر پہنچ گیا تھا۔ نہ صرف اندر پہنچ گیا تھا بلکہ سیٹ پر بھی قبضہ جما لیا تھا۔ میں نے کہا۔ "سائیں، تھوڑی جگہ دے دو۔" "یہاں کہاں جگہ ہے بھائی۔" سائیں نے ذرہ بھر بھی شناسائی نہ دکھاتے ہوئے کہا "اپنے بکسے

پر ہی بیٹھ جاؤ نا۔"

میں اپنے ٹکٹ پر بیٹھ سکتا تھا مگر اس حالت میں مجھے اس حسینہ کی پشت بھر دکھائی دیتی جب کہ میں اس کا مکھڑا دیکھتا رہنا چاہتا تھا۔ اس لیے میں ہٹ دھرمی پر اتر آیا۔ "جگہ ہے کیسے نہیں۔ تم نے دو ٹکٹ لی ہیں کیا؟ اتنے موٹے ہو۔ دو دو سیٹ گھیر رکھی ہے۔ ہٹو ادھر۔"

ٹھنس ٹھنسا کر بیٹھ گیا میں۔ موٹا بیوپاری احتجاج بھی نہ کر سکا۔ بیٹھتے ہی میں نے اس موٹی پنجابی عورت کا قصہ سنا دیا جسے اناج کے تھیلی کی طرح کمپارٹمنٹ میں چڑھا یا گیا تھا۔ ایک زور کا قہقہہ پڑا۔ بیوپاری خفت سے کچھ اور سمٹ گیا۔ میں نے اطمینان سے پھیل کر پشت پیچھے ٹکالی۔

قلی کے ساتھ بقیہ سامان لیے شوہر آیا۔ اس کے بیٹھنے نہ بیٹھتے بیوی بولی "کیسے سر پر چڑھے آ رہے ہیں لوگ۔ یہاں بیٹھنے پر تو پورے وقت آنے جانے والوں کی لاتیں کھانی پڑیں گی۔"

"ادھر والی سیٹ پر کیوں نہ بیٹھیں؟" شوہر نے پوچھا۔

"وہ پہلے ہی روکی جا چکی تھیں۔"

تو پھر خاموش بیٹھو جب پتہ ہے کہ ادھر کی سیٹ نہیں مل سکتی تو کڑھنے سے کیا فائدہ؟ سیٹ مل گئی اسے غنیمت سمجھو۔"

آدھا گھنٹہ نہ گذرا تھا کہ کمپارٹمنٹ میں قیامت کی بھیڑ ہو گئی۔ ایک سردار مجھ سے پوچھے بغیر میرے ٹکٹ پر بیٹھ گیا۔ میں نے کچھ نہیں کہا۔ ٹکٹ ٹوٹ جانے والی چیز نہ تھی پھر میرے ٹکٹ سے کسی کا بھلا ہو اس میں برائی کوئی نہ تھی۔ گرمی غضب کی تھی۔ کھچا کھچ بھرے ڈبے میں ہوا آنے کی ذرا بھی گنجائش نہ تھی۔ ٹرین روانہ ہوئی تو سب کی جان میں جان آئی۔ ایک طویل سانس لے کر میں نے مسافروں کا بغور مطالعہ شروع کیا۔ اوپر کی دونوں برتھ فوج کے ڈو بیجر گھیرے ہوئے تھے۔ کمپارٹمنٹ میں صرف دو عورتیں تھیں۔ اس حسینہ کے علاوہ ایک بوڑھی گجراتن اور۔ باقی سب ایسے تھے جنہیں دوسروں سے الگ کرنا آسان تھا، نہ ضرورت تھی۔

گجراتن بار بار ساڑی کے آنچل سے چشمہ صاف کرتی اور اس حسینہ کو گھورنے لگتی۔

اسے نزدیک ہی کے اسٹیشن پر اترنا تھا شاید .... جھولا ہاتھ میں لیے نینا بیٹھی تھی، مسافروں میں کچھ گپ شپ میں مشغول ہو گئے تھے۔ کچھ اونگھ رہے تھے۔ مگر وقفے وقفے سے ہر کوئی اس حسینہ پر نظریں مرکوز کر دیتا تھا۔ اس نے بھی اس بات کو محسوس کر لیا تھا اور کچھ بے چین نظر آتی تھی۔ ایک مرتبہ شوہر کی طرف جھک کر بولی تھی۔

"سب کے سب ایسے گھور رہے ہیں جیسے پہلے کبھی عورت دیکھی نہ ہو۔"

شوہر سے تسلی کے دو بول سن کر شاید وہ مطمئن ہونا چاہتی تھی مگر وہ شخص نہ جانے کس مٹی کا بنا ہوا تھا.... بے پرواہی سے بولا۔ "جنرل ڈبے میں یہ سب ہوتا ہی ہے۔ کہا تھا تم سے کہ زنانہ ڈبے میں چلی جاؤ۔ میں کچھ کہتا ہوں تو سوچ سمجھ کر کہتا ہوں، دنیا دیکھی ہے میں نے۔ مگر تمہاری آنکھیں تو ہمیشہ آسمان پر رہتی ہیں۔ اپنے سامنے کسی کو کچھ سمجھتی نہیں ہو تم خواہ مخواہ کی ضد نہ کرتیں تو ....."

"خوامخواہ کی ضد کیا؟" بیوی بھبک کر بولی۔ "تمہاری اماں علیل ہوتی ہیں تو تم دوڑ دوڑ کر نہیں جاتے؟"

"جاتا ہوں تمہارے اماں کے علیل ہونے پر بھی جاتا ہوں.... مگر اس بار تم نے ایسی جلدی مچائی.... ابھی چلو.... ابھی چلو کہ بس۔ تمہارے بھائی نے لکھ تو دیا تھا کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں.... پھر میں نے تمہیں لے جانے سے کب منع کیا۔ سوچا تھا کہ ریزرویشن کرا کے اطمینان سے نکلیں گے مگر تم نے ایڈجسٹ کرنا تو سیکھا ہی نہیں"

ہر چند کہ دونوں دھیمے لہجے میں گفتگو کر رہے تھے۔ بیوی کی غصے سے لال بھبوکا رنگت اور شوہر کی چڑھی ہوئی تیوریاں سب راز آشکار کر رہی تھیں۔ عجیب تھے دونوں جب سے میں نے اسے دیکھا تھا دونوں ایک دوسرے کو بات بات پر کاٹنے کی کوشش میں لگے تھے۔ کمپارٹمنٹ میں ٹھنڈے مشروب فروخت کرنے والا آیا تو شوہر نے ملکا لے کر بیوی کی طرف بڑھایا اس نے سر ہلا کر انکار کرتے ہوئے کہا۔ "ملکا نہیں میں گولڈ اسٹاپ لوں گی۔"

سردار نے بھی گولڈ اسٹاپ لیا۔ دو تین گھونٹ میں بوتل خالی کر کے شوہر سے بولا "بی بی کو لے کر اس ڈبے میں کیوں آئے؟ برتھ کے لیے کوشش کرتے بی بی کو یہاں بڑی.... تکلیف ہو گی۔"

. . . . . بڑی لفظ کو کافی کھینچا تھا اس نے۔

"ضروری کام آ جانے سے نکلنا پڑا۔ دونوں بچوں کے امتحان چل رہے ہیں اس لیے انہیں ان کی پھوپھی کے پاس چھوڑ کر نکلے ہیں۔ بچے بھی ساتھ ہوتے تو اور مشکل ہوتی ریزرویشن کرانے کا وقت نہیں ملا۔ اب ٹی ٹی کے پیچھے گھومنے سے کچھ حاصل نہ ہوگا ٹرین یہاں سے چلی ہے۔ برتھ ملنا ممکن نہیں۔"

"کوشش کرنے میں کیا حرج ہے؟" بیوی درمیان میں بول پڑی۔ شوہر نے اسے گھور کر دیکھا۔ اس کے گھورنے کو ان دیکھا کر کے بیوی نے کہا۔ "اگلے اسٹیشن پر اتر کر بات کرنا۔"

"اول تو یہاں سے اتر کر جانا ہی ممکن نہیں" شوہر نے صاف انکار کر دیا۔ بیوی پھر کچھ نہیں بولی۔

کون سا ضروری کام انہیں آ پڑا تھا یہ جاننے کی کوشش سردار جی نے نہیں کی۔ وہ بیوی کو گھورنے میں مشغول تھا۔ بات چیت شروع کرنے کی غرض سے بھی شاید وہی تھی کہ اسے دیکھنے کا موقع ملتا رہے۔

بیوی سیٹ پر پاؤں اوپر کر کے بیٹھ گئی تھی۔ شوہر کسی خیال کے آنے پر اٹھا۔ سوٹ کیس دونوں سیٹوں کے درمیان رکھ کر اس پر ہولڈر رکھا تو تین سیٹوں کی برتھ سی بن گئی۔ بیوی نے پاؤں پھیلا کر شوہر کی سیٹ پر رکھ دیے۔ سردار دانت نکال کر بولا "لو، بی۔ تی کے برتھ تیار ہو گئی۔ آرام کرو جی اب۔"

بیوی کچھ نہ بولی۔ کھڑکی کے باہر دیکھنے لگی۔ شوہر نے آنکھیں بند کر کے بدن ڈھیلا چھوڑ دیا۔ . . . میں بیوی کو گھورنے لگا۔ . . . جیسا کہ شوہر نے بھی کہا وہ دو بچوں کی ماں ہے۔ . . . پھر بھی کتنی خوبصورت، کتنی دلکش ہے! غصے میں اور بھی حسین لگتی ہے۔ . . . تیکھا مرچ ہے۔ ذرا ذرا سی بات پر غصے میں تنتنے پھلا لیتی ہے۔ خیر یہ کوئی نئی بات نہیں۔ حسن کا غرور اور غصے کے ساتھ چولی دامن کا ساتھ ہے۔ البتہ شوہر پر مجھے حیرت تھی۔ بیوی کے ساتھ اس کا سلوک بے رحمانہ تھا۔ بات بات پر اسے جھڑک رہا تھا۔

کسی پل پر سے گاڑی گذری۔ میں چونک گیا۔ شوہر پر پل کی گڑگڑاہٹ کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ گہری نیند میں ڈوب گیا تھا۔ بیوی کچھ بے چین سی نظر آ رہی تھی۔ سیٹ پر اسے

کسمساتے دیکھ کر میں سمجھا اسے باتھ روم جانے کی ضرورت پیش آرہی ہے۔ باتھ روم تک کا راستہ مسافروں سے اٹا پڑا تھا۔ وہ باتھ روم جانے میں ہچکچا رہی تھی شاید۔ فضول کی شرم ہے یہ! میں نے سوچا۔ اٹھ کر جاتی کیوں نہیں یہ! یہاں اپنا راستہ خود بنانا ہوتا ہے۔ کوئی ایک طرف ہٹ کر دوسرے کو راستہ نہیں دیتا۔ دوسروں کو دھکیل کر اپنا راستہ بنانا ہوتا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ارادہ ہوا کہ اس کے شوہر کو جگا کر کہوں کہ اس کی مدد کرے یا بیوی ہی سے کہوں کہ اپنے شوہر کو جگاؤ اور فارغ ہو آؤ۔ کیا فائدہ بلا وجہ کی بے چینی سے ؟

مگر اتنی پہلے کی اسٹیشن پر اتر گئی تھی ورنہ وہی اس کا ساتھ دیتی۔ میں منتظر تھا کہ اس کی نظر میری طرف اٹھے اور میں اشارے سے اسے صلاح دوں۔ مگر صلاح دینے کا موقع آیا ہی نہیں۔ اچانک سردار جی پر جو میری نظر پڑی تو بیوی کی بے چینی کا سبب سمجھ میں آگیا۔ میرے بکسے پر بیٹھا وہ نالائق سردار جی بیوی کے بالکل قریب جا پہنچا تھا۔ وہ یقیناً اسے چھیڑ رہا تھا۔ ۔ ۔ ۔ میں نے اس کی انگلیاں بیوی کی پشت پر رینگتی دیکھیں۔ بیوی نے پہلو بدل لیا۔

مجھے غصہ آیا۔ بدمعاش میرے بکسے پر بیٹھ کر حرامی پن کر رہا ہے۔ جی چاہا اس سے کہوں، اٹھ میرے بکسے پر۔ کیا اسی لیے تجھے اپنے بکسے پر بیٹھنے کی اجازت دی تھی کہ تو شریف عورتوں سے چھیڑ چھاڑ کرے،،

حالانکہ میں بھی بیوی کو برابر گھور رہا تھا مگر میرے دل میں پاپ نہیں تھا۔ پھول کا دھرم خوشبو پھیلانا اور آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچانا ہے۔ ۔ ۔ ۔ پھول کا رس پینا بھونرے کا دھرم ہے۔ خوبصورت عورت کو دیکھنا مرد کی فطرت ہے، وہ مجھے اچھی لگ رہی تھی، میں دیکھ رہا تھا۔ ۔ ۔ کسی بھی طرح اس کی تذلیل کرنا میرا مقصد نہیں تھا بلکہ ایک طرح سے وہ میرے لیے قابل احترام ہستی تھی۔ میں اس کا ممنون تھا کہ اس نے اپنی موجودگی سے میرے سفر کو خشک اور بور ہونے سے بچالیا تھا۔ وہ سردار جی شاید یہ نہیں جانتا تھا کہ ہر خوبصورت پھول شاخ سے جدا کر کے کالر میں سجانے کے لیے نہیں ہوتا۔ جانتا ہوتا تو یوں پانچ پچاس لوگوں میں بیٹھ کر حرامی پن نہ کرتا۔

سردار کے دل میں چور تھا۔ ۔ ۔ ادھر ادھر دیکھتا جاتا کہ کوئی اس کی حرکت دیکھ تو

نہیں رہا، مجھ سے ایک مرتبہ نظریں ملیں تو میں نے سخت نظروں سے اسے تنبیہہ کی۔ اس نے بے اختیار ہاتھ پیچھے کر لیا مگر پانچ منٹ نہ بیتے ہوں گے کہ دوبارہ وہی حرکت شروع کر دی۔ اب سیدھے سیدھے تو میں اسے کچھ کہہ نہیں سکتا تھا۔ میں تو کیا، اس کا شوہر بھی اسے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ خجالت کا سامنا کرنا پڑتا ہے ہاتھ کچھ آتا نہیں ایسے حالات میں۔

گذشتہ سال کی بات ہے..... میں بمبئی جا رہا تھا۔ ایک نوجوان ایک ملٹری والے سے الجھ پڑا۔ وہ ملٹری والا بڑی دیر سے اس کی نئی نویلی بیوی کی چٹکیاں کاٹ رہا تھا۔ نوجوان نے ٹوکا تو الٹا اسی پر دھونس جمانے لگا۔ "کون سی حور پری ہے تیری جورو! (حور پری تو وہ واقعہ وہ نہیں تھی مگر جوان بھرپور تھی۔) غلطی سے ہاتھ کیا لگ گیا۔ لگا اودھم مچانے۔ ایسی ہی پیاری تھی عورت تو ریزرویشن کرایا ہوتا فرسٹ کلاس کا..... ایر کنڈیشنڈ کوپے میں بیٹھا ہوتا۔ کیوں آیا ہے بیچ بازار میں جورو کی نمائش کرنے۔ یہاں تو غنڈے، بدمعاش بیٹھتے ہیں، تو بڑا شریف ہے تو یہاں نہ بیٹھتا تھا۔"

اسے ہی کہتے ہیں چوری اور سینہ زوری۔ کسی نے بھی نوجوان کا ساتھ نہیں دیا تھا۔ بات بڑھتی دیکھ، دلہن ہی نے نوجوان کو خاموش کرایا تھا۔۔۔

اب اس حسینہ کا شوہر جاگ بھی جائے تو کون سا تیر مارلے گا۔ ریلوں اور بسوں کے سفر میں یہ عام بات ہے۔ جنس زدہ شریف صورت بدمعاش موقع محل نہیں دیکھتے خاتون خانہ اور خاتونِ محل میں فرق نہیں کرتے..... ہر عورت کو طوائف سمجھ لیتے ہیں۔ جیسے وہ ان کی نازیبا حرکت برداشت کر لے گی اور احتجاج نہ کرے گی۔

کوئی اسٹیشن آیا۔ پتی جاگ گیا۔ ککڑی والے نے کھڑکی کے پاس آ کر آواز لگائی۔ شوہر نے بیوی کی طرف دیکھا۔ اس نے اثبات میں سر کو جنبش دی۔ اتنی دیر میں پہلی مرتبہ دونوں کسی بات پر متفق ہوئے تھے۔ چاہے وہ ککڑی کھانا ہی کیوں نہ رہا ہو۔ ککڑی کھانے کھانے بیوی نے شوہر کی طرف جھک کر آہستہ سے کہا "یہ پیچھے بیٹھا ہوا سردار جی بہت تنگ کر رہا ہے۔"

شوہر نے سردار کی طرف دیکھ کر کہا، "جنرل ڈبے میں بیٹھو گی تو یہ سب برداشت کرنا پڑے گا۔ آپ ذرا اس پر نگاہ رکھیں تو پھر جرأت نہیں کرے گا۔" بیوی نے

ملتجیانہ لہجے میں کہا۔

"میں کیا پہرے داری کرتا بیٹھوں؟" شوہر نے اسے جھڑک کر کہا

"آپ نہیں دیکھیں گے اس معاملے کو تو کیا دوسرے دیکھیں گے؟ دوسروں سے کہوں پہرے داری کرنے کے لیے،" وہ بھی تیز ہو کر بولی۔

"دوسرے پہرے داری نہیں کرتے۔ تنگ کرتے ہیں۔ پہرے داری کرنے کے لیے، خدمت بجالانے کے لیے تو شوہر ہوتا ہے۔ پہلے ہی تم سے کہہ رہا تھا،"

"بس کرو۔ کتنی بار دہراؤ گے۔ کچھ کر نہیں سکتے تو خاموش بیٹھو،"

بیوی نے تنگ کر کھڑکی سے باہر دیکھنا شروع کر دیا۔

ٹرین اسٹیشن سے آگے چلی تو اچانک مجھے اپنے سامنے کی سیٹ کے نیچے، ایک بکسا سما سکے اتنی جگہ نظر آئی۔ سردار کو کھڑا کر کے میں نے اپنا بکسا سیٹ کے نیچے کھسکا دیا مقصد اس سے میرا یہ تھا کہ سردار کھڑا رہے جس سے اس حسینہ کو نہ ستا سکے۔ مگر وہ بھی اول نمبر کا بدمعاش تھا۔ فوراً اپنا وی۔ آئی پی سوٹ کیس اتار کر اس پر بیٹھ گیا۔ میں نے دل ہی دل میں اسے گالی دی — "سور کا بچہ!" اور میں کر بھی کیا سکتا تھا۔

شام گہری اتر آئی تھی۔ مسافر اونگھنے لگے۔ ٹرین کے اس ڈبے میں کھانے انتظام تو ہوتا نہیں۔ جنہیں کھانا تھا وہ پچھلے اسٹیشن پر پوری بھاجی لے کر کھا چکے تھے۔ پیچھے کی سیٹوں پر کالج کے طالب علم کورس میں فلمی گیت گا رہے تھے ۔ ۔ ۔ ۔ شوہر نے بیوی کو طرف جھک کر کہا — "آرام کرو تم۔ میں ہوں یہاں پہرے داری کرنے کے لیے،"

بیوی نے زخم خوردہ نظروں سے اسے دیکھا پھر چہرہ کھڑکی کی طرف کر لیا ۔ ۔ ۔ لیٹی نہیں حالانکہ نیند کے خمار سے اس کی آنکھیں بوجھل ہو رہی تھیں۔

میرے سامنے کی سیٹ پر بیٹھا ہوا ایک نوجوان بہت دیر سے جھکولے کھا رہا تھا۔ ایک مرتبہ اس کا سر زور سے سیٹ کی پشت پر ٹکرایا تو وہ جھنجھلا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اپنی اٹیچی کھول کر چادر نکالی اور سیٹوں کے درمیان کی جگہ میں بچھانے لگا ۔ ۔ ۔ ۔ ایک شخص نے اعتراض کیا — "یار، رات ہمیں بھی کاٹنی ہے۔ چین سے پاؤں بھی نہیں پھیلانے دو گے کیا؟"

نوجوان چادر پر پسرتا ہوا بولا، "میرے بدن پر پاؤں رکھ لو بھائی مگر مجھے لیٹنے سے

نہ روکو۔ نیند نہیں سہاری جاتی اب"

بجلی کی سی تیزی سے مجھے خیال آیا۔ نوجوان کی خالی سیٹ کو پاؤں سے روک کر میں نے پکارا ۔"سردار جی آجاؤ، تمہارے لیے سیٹ روکی ہے۔"

سردار وہاں سے اٹھنا کب چاہتا تھا۔ بے دلی سے بولا "رہنے دو بھائی یہاں بھی تو بیٹھا ہی ہوں"، پھر اپنے پاس کھڑے ایک دیہاتی سے بولا "جا بھائی، تو بیٹھ جا۔ بہت دیر سے کھڑا ہے۔"

"تم آؤ سردار جی! تمہارے لیے سیٹ روکی ہے۔" میں نے تحکمانہ لہجے میں کہا تو سردار کو اٹھنا پڑا۔ اس کے اٹھتے ہی دوسرا مسافر اس کی جگہ بیٹھ گیا۔ حسینہ اور اس کے شوہر کے چہروں پر ہلکی سی مسکراہٹ چھا گئی۔ حسینہ کو پہلی بار میں نے مسکراتے دیکھا مسکراتی ہوئی وہ اور قیامت لگی۔ اس نے آنکھوں آنکھوں میں شوہر سے کچھ کہا۔ شوہر نے اٹھ کر سفری بیگ میں سے چادر نکالی۔ ہولڈال رکھ کر بنائی گئی برتھ پر چادر بچھا کر بیوی لیٹ گئی۔ پاؤں سیدھے کر کے اس نے شوہر کی سیٹ پر رکھ دیئے۔ شوہر نے آگے کھسک کر بدن ڈھیلا چھوڑ دیا اور آنکھیں بند کر لیں۔

میں دل ہی دل میں اترا رہا تھا جیسے کسی راج کماری کو کسی راکشش کے ہاتھوں سے چھڑا لایا ہوں۔

موٹا سندھی بیوپاری گلے سے عجیب قسم کی غرغراہٹ نکالتا ہوا مجھ پر لدا پڑ رہا تھا اس کے من بھر کے سر نے میرا بایاں کندھا کنشل کر دیا تھا۔ کہاں تو وہ کھڑا، کھڑا رات کاٹنے کی بات کر رہا تھا۔ کھڑا کھڑا سو جاتا اور کسی پر گر جاتا تو کیا حال ہوتا اس کا جس پر وہ گرتا؟ مجھے سوچ کر ہی ہنسی آ گئی۔

نیند سے میرا بھی سر بھاری ہو رہا تھا مگر سونے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ اس حسینہ نے چہرے پر ساڑی کا آنچل ڈال لیا تھا۔ چاند بادلوں کے پیچھے ہوتا ہے تو سرمئی کرنیں بادلوں کو سنہری گوٹ سے سجا کر چاند کی موجودگی کا اشارہ دے دیتی ہیں... نیلی ساڑی کے پیچھے چمکتا چاند سا چہرہ میری آنکھوں میں نشہ اتار رہا تھا.... میں سویا نہیں لیکن مدہوش ہو گیا۔

پتہ نہیں مدہوشی کی یہ کیفیت مجھ پر کتنی دیر تک طاری رہی۔ آدھا گھنٹہ یا پون گھنٹہ

اس سے زیادہ ہرگز نہیں۔ آنکھ کھلتے ہی نظر پہلے حسینہ کی طرف گئی۔ وہ بدحواس بیٹھی اپنا بازو مل رہی تھی۔ مجھے مسرت آمیز حیرت ہوئی۔ چند لمحوں کے ساتھ نے ہم دونوں میں کیسا جذباتی تعلق بنا دیا تھا کہ اس کی تکلیف سے میں جاگ اٹھا تھا . . . . ورنہ میری نیند مشہور ہے میرے دوست اور خاندان والے میری نیند کو کمبھ کرنی نیند کہتے ہیں۔ یہ کیسی سامری تھی؟ جس نے مجھے باندھ لیا تھا۔ میں اس کا اسیر ہو گیا تھا مگر بے بس تھا۔ اس کے لیے کچھ کر نہیں سکتا تھا۔ وہ اپنے شوہر کے ہمراہ تھی۔ اس کا شوہر بھلا کیوں پسند کرتا کہ کوئی دوسرا اس کی بیوی کا ہمدرد بنے۔ وہ ہی کیوں اپنے شوہر کی موجودگی میں مجھ سے مدد کی طالب ہوتی۔ اس نے تو اس وقت بھی میری طرف تشکرانہ نگاہ نہیں ڈالی تھی جب میں نے سردار کو اس کی جگہ سے اٹھا کر اسے سردار کی دست درازیوں سے بچایا تھا . . . . لیکن دوسرے ہی لمحے میں نے اپنے خیال کی تردید کی . . . . میں بے کار ہی اسے موردِ الزام ٹھہرا رہا ہوں۔ بھلا اسے پتہ کب ہے کہ کوئی اس کے لیے کیا کر رہا ہے یہ تو میری اپنی جذباتیت ہے جو خود کو اس سے وابستہ کر کے اس کے لیے فکرمند ہو رہی ہے۔ اسی وقت بیوی نے جھک کر شوہر کا شانہ ہلایا۔ وہ ہڑبڑا کر جاگا۔ بیوی دھیمی آواز میں جلدی جلدی اس سے کچھ کہنے لگی۔ ذلت، غصے اور بے بسی کے ملے جلے جذبات سے وہ رہانسی ہو رہی تھی۔ اس کی بات ختم ہوتے نہ ہوتے شوہر نے بیوی کی پشت کی طرف نظر ڈالی تو میری نظر بھی ادھر اٹھ گئی۔ اف وہ کمبخت سردار جی! وہ پھر اپنی پرانی جگہ پر جا بیٹھا تھا . . . حالانکہ وہ آنکھیں بند کیے بیٹھا یہ ظاہر کر رہا تھا کہ وہ سو رہا ہے مگر حقیقتاً وہ جاگ رہا تھا۔ پپوٹوں کے اندر اس کی حرکت کرتی ہوئی پتلیاں صاف محسوس کی جا سکتی تھیں — میں سمجھا ضرور اسی نے کوئی نامناسب حرکت کی تھی جس نے بیوی کو بدحواس کر دیا تھا۔ یکبارگی کمپارٹمنٹ میں سناٹا تھا۔ مسافر ایک دوسرے پر لڑھکے پڑے تھے۔

بیوی کی بات ختم ہونے پر شوہر نے اس سے کچھ کہا، بیوی نے انکار میں سر ہلا دیا۔ شوہر دانت پیسنے لگا۔ پتہ نہیں اسے اس لفنگے سردار پر دانت پیس رہا تھا یا نافرمان بیوی پر . . . . مگر اس کا خاطر خواہ اثر بیوی پر ہوا۔ ایک جھٹکے سے وہ لیٹ گئی اور ڈبے کی دیوار کی طرف اس نے منہ کر لیا۔

شوہر بیٹھا ہونٹ کاٹ رہا تھا۔ اس نے جیب سے سگریٹ نکال کر سلگائی، اور

دھیرے دھیرے کش لینے لگا۔اس کی نظر سردار پر تھی۔ دس منٹ نہ بیتے ہوں گے کہ سردار نے آنکھیں کھولیں تھوڑا سا اٹھا ہوا مگر شوہر پر نگاہ پڑتے ہی فوراً آنکھیں بند کرلیں۔ دو تین مرتبہ ایسا ہی ہوا۔ایک سگریٹ ختم نہ ہوتی کہ شوہر دوسرا سگریٹ سلگا لیتا۔ سردار تھوڑی تھوڑی دیر میں آنکھیں کھولتا اور شوہر کو ہشیار پاکر آنکھیں بند کر لیتا

میرے بابا بہت بڑے شکاری تھے۔ اکثر وہ اپنے شکار کے واقعات سنایا کرتے۔ ایک آدم خور شیر کا واقعہ وہ خصوصاً دلچسپی سے سناتے۔ بابا نے اسے ختم کرنے کا تہیہ کر لیا تھا۔ کئی مرتبہ چارا باندھ کر پوری پوری رات انہوں نے مچان پر گذاری وہ شکار نہ ہوا۔ بابا کہتے۔ . . . " جیسے میں اس امر سے بخوبی واقف ہوتا تھا کہ وہ پیچھے جھاڑیوں میں موجود ہے اور چارے پر جھپٹنے کی تاک میں ہے، ویسے ہی وہ بھی میری موجودگی سے باخبر ہوتا تھا۔ وہ میرے غافل ہونے کا منتظر رہتا تھا میں اس کی غلط حرکت کا "....

کئی روز تک یہ آنکھ مچولی چلتی رہی۔ تب جاکر کہیں پانچویں دن بابا اس کا شکار کرنے میں کامیاب ہوئے تھے۔

شوہر کو یوں چوکنا بیٹھے دیکھ کر مجھے بابا کی یاد آئی۔ . . . سردار اس کوشش میں تھا کہ شوہر کی نظر چوکے اور وہ کچھ کر گذرے اور شوہر اسے یہ موقع نہ دینے کے لیے کوشاں تھا۔

آدھی رات تک جاگ کر میں یہ آنکھ مچولی دیکھتا رہا۔ پھر مجھے خود پر جھنجلاہٹ ہونے لگی ۔ یہ کیا بے وقوفی ہے ؟ میں کیوں جاگ کر پہرے داری کر رہا ہوں ؟ اس سے مجھے کیا ملے گا ؟ شوہر نے شادی کے بندھن میں بندھ کر اس کے تحفظ کی ذمہ داری قبول کی ہے۔ وہ اپنی ذمہ داری نبھا رہا ہے۔ بیوی نے اپنی حفاظت کی درخواست بھی اسی سے کی ہے۔ اس کی حفاظت نہ میرا فرض ہے نہ مجھے اس کا کریڈٹ ملے گا۔ . . . پھر کیوں اپنی نیند برباد کر رہا ہوں، اس خیال سے میری عقل ٹھکانے آئی اور میں فوراً نیند کی آغوش میں جا پہنچا۔

دوبارہ جب میری آنکھ کھلی تو سویرے کے چار بج رہے تھے۔ سگریٹ کا دھواں اڑاتا ہوا شوہر اب بھی چوکنا بیٹھا تھا۔ سردار بیٹھا اُلوؤں کی طرح آنکھیں پٹپٹا رہا تھا . . . شاید

ایک بہنڈے کر اٹھا تھا۔ اچانک وہ کھڑا ہو کر اپنی لنگی ٹھیک کرنے لگا۔ شوہر نے سخت لہجے میں پوچھا۔

"کیوں؟ کیا ارادہ ہے؟"

"باتھروم جائیں گے ذرا" کہہ کر سردار مڑا۔ اس کی طرف کے باتھروم کے راستے میں مسافر فرش پر ایک دوسرے پر لڑھکے پڑے تھے۔ وہ دوسری طرف بڑھا اس کے لیے اسے شوہر کے سامنے سے گذرنا تھا۔ شوہر اسے گھور رہا تھا۔ وہ اس کے سامنے سے گذرا۔ دھڑام!!! پتہ نہیں کیا ہوا؟ ایک زور کی آواز کے ساتھ سردار اوندھے منھ نیچے گر پڑا۔ گرتے ہوئے اس کا سر برتھ سے ٹکرایا۔ نیچے سوئے ہوئے جن آدمیوں پر وہ گرا تھا وہ چیختے ہوئے اٹھ بیٹھے۔

کیا ہوا؟ کیا ہوا؟..... پوچھتے ہوئے کئی مسافر سردار کو اٹھانے دوڑے۔ شوہر ان میں پیش پیش تھا۔ بیوی بھی جاگ کر حیران نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ سب جاننے کی کوشش کر رہے تھے کہ کیا ہوا؟ سوا میرے؟ میں اپنی سیٹ پر سے اٹھا بھی نہیں تھا۔

سردار کو اٹھا کر ایک سیٹ پر بیٹھا دیا گیا تھا۔ دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر آنکھیں بند کیے بیٹھا تھا وہ۔ شوہر سب سے کہہ رہا تھا۔ "میں جاگ رہا تھا سردار جی شاید باتھروم جا رہے تھے۔ لنگی میں پاؤں الجھ گیا..... میں نے دیکھا....."

..... لیکن میں نے جو دیکھا تھا وہ اس بیان سے یکسر مختلف تھا۔ میں نے صاف دیکھا تھا، سردار کو اٹھاتے اٹھاتے بھی شوہر نے کئی رگڑے دے ڈالے تھے اور اس سے پہلے باتھروم جاتے ہوئے سردار جی کو پاؤں اڑا کر گراتے ہوئے بھی صاف دیکھا تھا میں نے۔
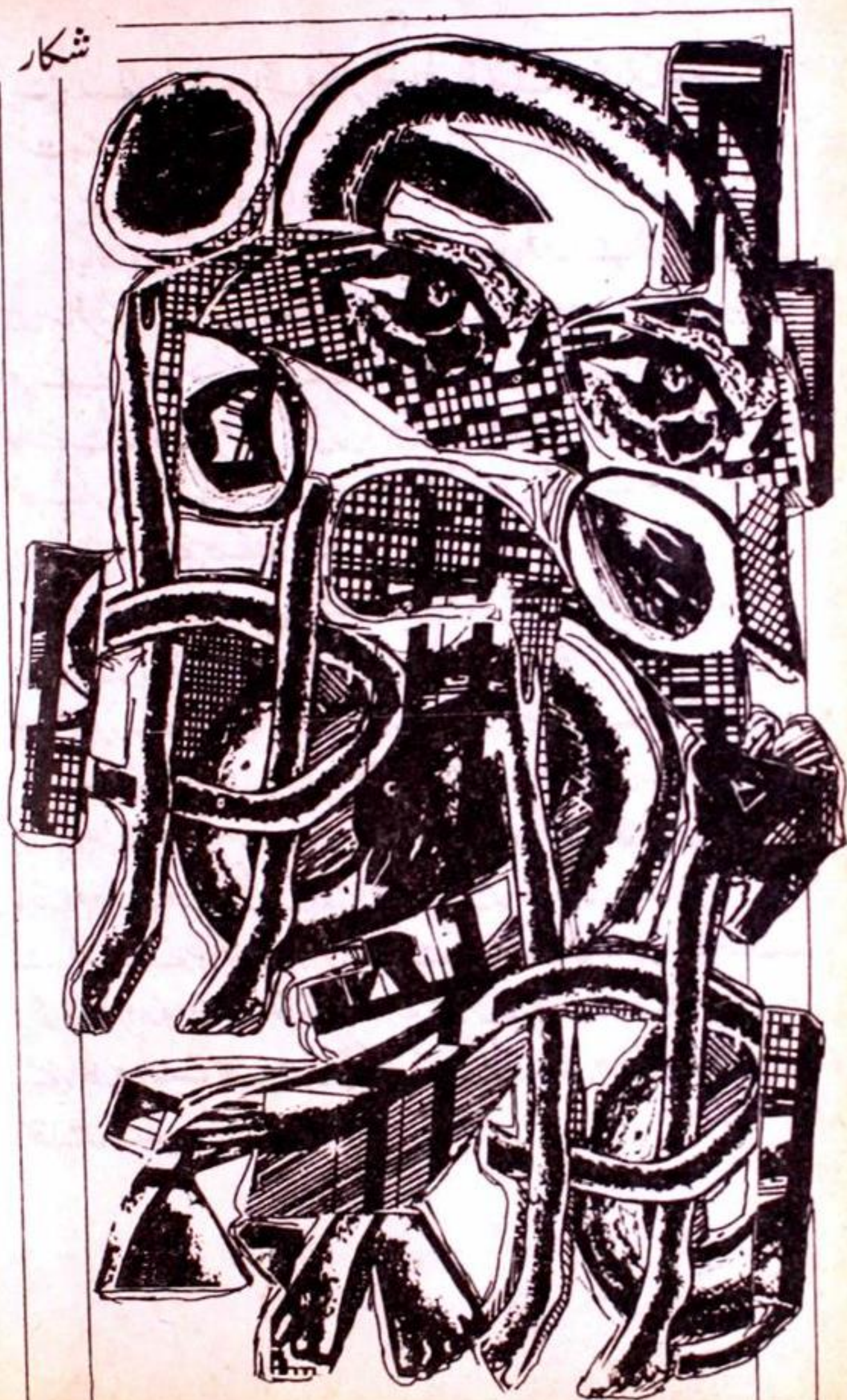
شکار
شکار

رنگوں کو کوئی پکڑ سکا ہے نہ خوشبو کو کوئی باندھ سکا ہے۔ ہزاروں خواہشیں سیکڑوں خیالات دل کے بے رحم جال میں پھنس کر پھڑپھڑاتے ہیں جدو جہد کرتے ہیں؟ مگران میں سے کتنے الفاظ کا جامہ پہن کر آزاد ماحول میں آپاتے ہیں؟ یقیناً بہت کم۔ زیادہ تر تو وہیں دم توڑ دیتے ہیں۔ حد سے تجاوز کرنا آسان نہیں ہوتا مگر بہت سے حالات میں مناسب بھی نہیں ہوتا۔ بند مٹھی سوا لاکھ کی ہوتی ہے اسی لیے کبھی کبھی کوئی خیال دِل کے نگینے میں جڑا ہوا ہی محفوظ ہوتا ہے۔

بچپن میں ایک کہانی سُنی تھی۔ ایک شہزادی بھیس بدل کر سیر کو نکلتی ہے ایک راجہ کے محل میں جاتی ہے تو راجہ کو شک ہوجاتا ہے کہ یہ معمولی لڑکی نہیں۔ راجہ اسے روک لیتا ہے۔ رات کو شہزادی کے پلنگ پر پھول کی ایک پنکھڑی رکھ کر سات گدے بچھا دیئے جاتے ہیں۔ راجہ چھپ کر دیکھتا ہے کہ شہزادی تمام رات بے چینی سے کروٹیں بدلتی ہے.... سویرے اٹھتی ہے تو سات گدوں کے نیچے رکھی ہوئی پھول کی پنکھڑی کا نشان اس کی پیٹھ پر پڑ چکا ہوتا ہے۔

میرے.... دل میں بھی ایسی ہی پھانس گڑی ہے جس کی کھٹک مجھے چین نہیں لینے دیتی۔

میرے سامنے دولت کا انبار لگا دو، خوشیوں کی برسات کر دو، میرے من کا سوکھا پیڑ کبھی ہرا نہ ہو گا۔

اس دن اُسے دیکھ کر من کی کسک اور بڑھ گئی تھی۔

وہ ایک بھکارن تھی۔ دوسری بھکارنوں جیسی۔ میلے کپڑوں سے جھانکتا جسم، گندے چکیٹ بال، گلے میں رنگ اُترے پھیکے موتیوں کی مالا . . . . ہاتھوں میں رنگ برنگی چوڑیاں . . . . حالات سے سمجھوتے کا سکون اس کے چہرے پر جھلکتا تھا۔ ادھیڑ عمر کی اس بھکارن کی شخصیت میں سب سے زیادہ حیرت انگیز تھا اس کی گود کا بچہ۔ بھیک مانگنے والیوں کی گود میں بچے کی موجودگی کوئی ایسی خاص بات نہیں۔ بچے تو بھگوان کی دین ہیں جسے ملے وہ دھنی، جسے نہ ملے وہ بھکاری۔ خاص بات یہ تھی کہ بھکارن اپاہج تھی۔ گھٹنوں سے نیچے اُس کے دونوں پانو نہیں تھے۔ ایک چھوٹے پہیے لگے تختے پر بیٹھی وہ ہاتھوں کو زمین پر ٹیک کر زور لگاتی اور تختے کو آگے بڑھاتی۔ گود میں بچہ لیٹا ہوتا۔ بے حس و حرکت جیسے اس میں زندگی نہ ہو۔ ایک دن ہوا سے بچے کے چہرے پر پڑا ہوا کپڑا ہٹ گیا تو میں نے دیکھا وہ ڈیڑھ سال کا ایک صحت مند بچہ تھا۔

پہلے دن میں نے اسے دس پیسے دیے پھر روزانہ پچاس پیسے کا سکہ دینے لگی۔ مجھے کار سے اُترتا دیکھ کر وہ تیزی سے پہیے گھماتی میرے نزدیک آجاتی۔ کسی دن میرے پہنچنے کا وقت آگے پیچھے ہو جاتا، وہ مجھے نہ ملتی تو ہوٹل کی بالکنی میں سے اُسے دیکھ کر میں سکہ نیچے پھینک دیتی۔

ایک دن تجسس سے میں نے پوچھا، "کہاں سے لائی اسے؟"

"میرا ہے؟" وہ نظریں چراتی ہوئی بولی۔

"تیرا؟؟؟" میری نظریں اس کے کٹے ہوئے پانو پر مرکوز ہو گئیں۔ میرے الفاظ کی تلخی سے تلملا کر وہ بولی "میں پال پوس رہی ہوں، اپنا ہے اسی لیے نا؟"

"بڑا ہو کر یہ کیا کرے گا؟ کبھی تو نے سوچا؟"

"سوچنا کیا؟ بھیک مانگے گا میری طرح"

کیوں نہیں اسے کسی یتیم خانے میں رکھ دیتی؟" میں نے صلاح دی۔ میری نظریں اس کے کٹے ہوئے پاؤں سے ہٹ کر بچے پر ٹک گئی تھیں۔

کیوں رکھوں؟ بھیک میں مجھے اتنا مل جاتا ہے کہ پیٹ بھر کھلا سکتی ہوں اسے۔"
بھکارن کی آواز میں فخر و غرور کی آمیزش تھی جو نہ جانے کیوں مجھے اچھی نہیں لگی۔ دل کو کہیں ٹھیس پہنچی۔ کہیں کوئی زخم ٹیس دے اٹھا۔ میں نے دوسرے ڈھنگ سے اس پر چوٹ کی۔ ہم لوگ اسی طرح چھوٹوں، مفلسوں اور کمزوروں کے حقوق غصب کرتے ہیں۔ انہیں بولنے نہیں دیتے۔ اگر کوئی اعتماد سے بول اٹھے تو اسے چپ کرانا ہم جانتے ہیں۔ آخر کو فخر و غرور ہماری میراث ہے نہ ان کی۔
"یہ ایسا چپ چاپ کیوں پڑا رہتا ہے؟ اس طرح تو اس کی جسمانی نشو و نما رک جائے گی۔ وہ "دوڑے گا بھاگے گا تو پکڑوں گی کیسے؟"
صرف جسمانی ہی نہیں دماغی نشو و نما رکنے کا بھی اندیشہ تھا۔ مگر اسے سمجھانا آسان نہیں تھا۔ پھر اس کی دلیل مجھے صحیح لگی کھو دینے کا ڈر پکڑ اپنے آپ گہری کر دیتا ہے۔ بعد میں پھول بیچنے والی نے مجھے بتایا کہ وہ بچے کو افیم کھلا کر رکھتی ہے۔
میں نے ابھی کہا نا کہ میرے دل کی کسک مجھے کہیں چین سے نہیں رہنے دیتی۔ کبھی کبھی نوبت ذلیل کراتی ہے۔ اب بھلا کیا ضرورت تھی مجھے اس سے پوچھنے کی۔
"کیا تمہارا دل نہیں چاہتا کہ تمہارا بچہ اچھا کھائے پیئے..... کھیلے کودے۔"
"چاہتا تو ہے بی بی جی! مگر اس کی قسمت میں نہیں لکھا تو کیا ہو سکتا ہے؟" وہ افسردہ ہو کر بولی۔
"کیوں نہیں ہو سکتا؟ خوبصورت صحت مند بچہ ہے، کسی ایسی عورت کو دے دو جو بے اولاد ہو۔"
"نہیں!!!" خوف زدہ ہو کر اس نے بچے کو دونوں ہاتھوں سے جکڑ لیا۔ میں اس کی طرف سے بے پروا اپنے آپ میں گم بولتی گئی۔ "وہ عورت اسے وہ سب خوشیاں، وہ آرام دے سکے گی جن کا تم نے خواب میں بھی تصور نہ کیا ہوگا۔"
"تمہارے کتنے بچے ہیں بی بی جی؟" اچانک وہ پوچھ بیٹھی۔
"میرے.....!!! میں سٹپٹا گئی۔ "میرے بچے نہیں ہیں"
بھکارن نے کچھ اس طرح سے سر کو جنبش دی کہ میں خود کو بے عزت سی محسوس کرنے لگی۔
عین اسی وقت میری آفس کار آ گئی۔ میں تیزی سے اس طرف بڑھ گئی۔ کار کے قریب پہنچتے پہنچتے میں نے سنا پھول والی پوچھ رہی تھی "کیا ہوا دی کیا کہہ رہی تھی کار والی بی بی جی؟"
بھکارن کی آواز میرے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ بن کر اتر گئی "..... کچھ نہیں..... "وہ نفرت سے زمین پر تھوکتی ہوئی کہہ رہی تھی..... "وہ مجھ سے بھیک مانگ رہی تھی۔"

بھیک

بھیک

کستور با چوک سے جو سڑک پورب
کی جانب جاتی ہے اس سڑک کی دائیں
طرف میرا محل نما مکان ہے۔ یہ سڑک
جیل روڈ کہلاتی ہے۔ سینٹرل جیل شاہراہ
سے ساڑھے تین کلو میٹر کے فاصلے پر ہے
اس سڑک پر پیدل چلنے والے یا تو صبح شام
کی سیر کے رسیا ہوتے ہیں یا کچہری کے
اوقات میں کچہری آنے جانے والے
سپاہی اور قیدی۔

اکثر اپنے مکان کے دریچے میں
کھڑی ہو کر میں انہیں دیکھتی رہتی ہوں۔
قیدیوں کو دیکھنے کا شوق ہے مجھے۔

صبح دس بجے کے قریب قیدیوں
کو ہتھکڑیاں لگا کر ان کی زنجیریں اپنے
ہاتھوں میں تھام کر سپاہی پیشی کے لیے
جاتے ہوتے ہیں۔ ان میں ہر عمر کے
لوگ نظر آتے ہیں۔ میں ان کے چہروں
کو پڑھ کر ان کے کردہ و ناکردہ جرائم کے بارے
میں اندازہ لگانے کی کوشش کرتی ہوں
اخبارات میں جو پڑھتی ہوں، جیسا سنتی
اور دیکھتی ہوں اس کے مطابق نو عمر لڑکے
جوا کھیلتے پکڑے جاتے ہیں یا جیب
کاٹتے ۔ ۔ ۔ ۔ یا پھر چھوٹی موٹی چوریاں
ان کے کھاتے میں لکھی ہوتی ہیں۔ بوڑھوں
کے بارے میں یقینی طور پر کچھ نہیں کہا جاسکتا

کبھی کسی چھوٹی سی بات کو پریسٹیج پوائنٹ بنا لیتے ہیں کبھی منظم طریقے سے جرم کرتے ہیں۔ نوجوانوں کے جرائم کا دائرہ بہت وسیع ہوتا ہے۔ عورت کو تنہا پایا، اٹھا لیا۔ موقع دیکھا، لوٹ لیا، بحث کی، چھرا گھونپ دیا۔ ایک مرتبہ جرائم کی دنیا میں قدم رکھا نہیں کہ قتل ڈکیتی تک پہنچ جاتے ہیں۔ عزت آبرو، شرم، ذلت کے احساس سے پرے ہوتے ہیں اس لیے بیڑی کا دھواں اڑاتے اپنے آپ میں مگن چلے جاتے ہیں

شام کو بھی قیدیوں کے کچہری سے لوٹتے وقت میں ان کے چہروں کو بغور دیکھتی ہوں پر امید چہرے، ناامید چہرے، امید ناامید کے سائے میں گھبراتے چہرے میں اب خوب پہچاننے لگی ہوں — البتہ پولس کی لاریوں میں جو قیدی لے جائے جاتے ہیں انہیں دیکھنے کا ارمان دل میں رہ جاتا ہے۔ کئی مرتبہ کے سزا یافتہ قیدی، قاتل، دہشت پسند، اور نکسل وادی عام انسان سے کہاں مختلف ہو جاتے ہیں؟ ممتا کی مورت عورت مجرم بن کر کیسی لگتی ہے؟ — ان سوالات کے جوابات مجھے نہیں مل پاتے۔ بعض اوقات میں سوچتی ہوں کہ اس سڑک پر سینٹرل جیل کی بجائے بچوں کا کوئی اسکول ہوتا — یا یوں ہوتا کہ شمال کی طرف جانے والی لمبی سڑک پر جہاں ایک نرسری اسکول ہے وہاں، اس طرف میرے مکان کا کوئی دریچہ کھلتا تو کتنا اچھا ہوتا۔ تمام دن قیدیوں کو نہ دیکھ کر میں بچوں کے پھول سے مکھڑے دیکھتی — کتنا خوش کن ہوتا یہ!

میرے شوہر بزنس کے سلسلے میں زیادہ تر شہر سے باہر رہتے ہیں۔ ہمارے بچے ہوسٹل میں رہ کر تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ صرف تعطیلات میں گھر آتے ہیں۔ اس محل نما مکان میں، میں تنہا اوپر نیچے کی منزلوں میں چکراتی رہتی ہوں۔

میرے بچپن میں، گھر میں، ایک توتا پلا ہوا تھا۔ سویرا ہوتے ہی میں اس کا پنجرہ کھول دیتی۔ وہ ٹیں ٹیں کرتا پورے مکان میں گشت لگاتا رہتا۔ باورچی خانے سے اپنے لیے مرچ اٹھا لاتا۔ دالان میں رکھے مٹکوں کے قریب جمع شدہ پانی سے اپنی پیاس بجھا لیتا۔ پھر اندھیرا گھرتے ہی اپنی پناہ گاہ میں واپس پہنچ جاتا۔ میں بھی تمام دن اپنے آپ کو مصروف رکھتی اور سرشام ہی گھر رہتی۔ نہ کبھی کسی چیز کو حاصل کرنے کے لیے جدوجہد کرنی پڑتی نہ زندگی میں خوف و پریشانی کے سایوں کا گذر تھا۔ راوی چین

ہی چین لکھتا تھا۔

میرے شوہر نے مجھے کلبوں پارٹیوں میں جانے اور گھر پر پارٹیاں اور پنچ کرنے کی مکمل آزادی دے رکھی تھی۔ اس معاملے میں ہم دونوں میں بڑی اچھی انڈر اسٹینڈنگ ہے گذشتہ کئی برسوں سے میں اسی معمول کے مطابق اپنے کو مصروف رکھتی آئی تھی مگر اب بڑھتی عمر میں، میں تنہائی پسند ہو گئی ہوں۔ دھوم دھڑاکے اور شور شرابے سے میرا جی بھر گیا ہے۔ اپنے محل نما مکان کے دریچے پر کھڑے ہو کر سڑک پر سے گذرنے والوں کو دیکھنا میرا پہلا شوق بن گیا ہے۔

ابتدا میں میرا دل خوب بہلا لیکن بھاگ دوڑ کم ہو جانے سے ایک نیا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا..... میرا جسم فربہی کی طرف مائل ہونے لگا..... آسمان میں اڑنے والوں پرندوں کی بہ نسبت پنجرے میں رہنے والا پرندہ زیادہ کاہل اور زیادہ سست ہوتا ہے۔ روزی روٹی کے لیے کوئی مشقت جو اسے کرنی نہیں پڑتی!

فیملی ڈاکٹر کے مشورے پر علی الصبح اٹھ کر میں نے ورزش کا معمول بنا لیا اور اسی دوران ان تینوں بوڑھوں کی جانب میری توجہ مبذول ہوئی۔

چاہے آپ کو قصے کہانی جیسی بات لگے۔ لیکن وہ تینوں یقیناً ہی تین مختلف سمتوں سے آتے تھے۔

ڈھیلا پتلون اور ڈھیلا بش شرٹ پہننے والا بوڑھا، جس کے ہاتھ میں چاندی کی موٹھ والی چھڑی ہوتی تھی۔ شمال کی جانب سے آتا تھا۔ دوسرا بوڑھا جو دھوتی کرتا پہنتا تھا جنوب کی جانب کہیں رہتا تھا۔ مغربی سڑک سے جو بوڑھا آتا وہ ہمیشہ کلف لگے پاجامے کرتے میں ملبوس ہوتا تھا۔

تینوں آتے اور سڑک کی بائیں کی طرف ایک پلیا پر بیٹھتے جاتے۔ یہ پلیا میرے دریچے کے ٹھیک سامنے تھی۔ تینوں آ چکتے تو ایک ساتھ جیل روڈ پر قدم بڑھاتے۔ پینٹ بش شرٹ والا شخص زیادہ بوڑھا اور کمزور تھا۔ اس کی رفتار دھیمی ہوتی۔ تینوں یوں تو ساتھ چلتے مگر کبھی کبھی دوسرے دونوں بوڑھے باتوں کے جوش میں آگے نکل جاتے..... پھر جیسے ہی انہیں احساس ہوتا کہ اپنی تیز خرامی سے وہ اپنے ساتھی کے تئیں بے انصافی اور ظلم کر رہے ہیں تو فوراً رک جاتے۔ اس کے قریب

آجانے کا انتظار کرتے۔ پھر اسے ساتھ لے کر اسی کی رفتار سے آگے بڑھتے۔

میرے دل میں اکثر خواہش ہوتی کہ سنوں، تینوں آپس میں کیا باتیں کرتے ہیں ویسے دیکھا جائے تو تجسس ہونا نہیں چاہیئے تھا تین بوڑھے مل جائیں تو بھلا کیا باتیں کریں گے؟ تینوں ملازمت سے سبکدوش ہو چکے لگتے تھے۔۔۔۔ ایسے میں گذری زندگی کی کھٹی میٹھی یادوں کو تازہ کرتے ہوں گے۔ اپنے بچوں، بچوں کے بچوں کی باتیں کرتے ہوں گے۔ بڑھاپے میں اور رہ ہی کیا جاتا ہے اگر یہ بھی نہ ہو۔

میں نے ان تینوں کے ساتھ کبھی کسی عورت یا بچے کو نہیں دیکھا۔ عورتیں یوں تو علی الصبح جاگتی ہیں مگر یا تو عبادت میں یا باورچی خانے میں مصروف ہو جاتی ہیں۔ بچے سویرے اٹھتے ہی اسکول جانے کی تیاری کرنے لگتے ہیں۔ مجھے حیرت اس بات پر ہوتی تھی کہ چھٹی کے دن اور شام کو کیوں کوئی ان کے ہمراہ نہیں ہوتا؟ تینوں کی شریک حیات، حیات نہ ہوں، تینوں دائمی مریض ہوں یا تینوں کے یہاں کوئی نواسہ پوتا نہ ہو۔۔۔۔ یہ قرینِ قیاس نہ تھا۔

ان تینوں میں سے کلف لگے کپڑے پہننے والا بوڑھا اکثر میرے کمپاؤنڈ کے باہر جھکی ہوئی کینر اور موگرے کی شاخوں سے پھول توڑا کرتا۔ یقیناً وہ یہ پھول اپنی شریک زندگی کے لیے لے جاتا ہوگا۔ تو وہ اس کے ساتھ کبھی نظر کیوں نہیں آتی؟ یہ کون بتاتا مجھے؟ کس سے پوچھتی میں۔

دو بوڑھوں کے ناموں سے میں اتفاقاً واقف ہو گئی تھی۔ ان کے ایک ساتھ مل کر آگے بڑھنے اور چوک پر ان کے جدا ہونے کے اوقات تک ان پر پوری طرح آنکھ اور کان لگائے رکھنے کی بناء پر۔

پینٹ شرٹ والا بوڑھا جو زیادہ عمر رسیدہ تھا، یا مقابلتاً زیادہ ضعیف لگتا تھا، رخصت ہوتے ہوئے بلند آواز سے کہتا۔ "برا پاٹل، برا بھاؤ صاحب۔ جیونت راہلو تر اودیا بھیٹو"۔ (اچھا پاٹل، اچھا بھاؤ صاحب۔ زندہ رہا تو کل ملوں گا) گو میں پاٹل اور بھاؤ صاحب کی علاحدہ علاحدہ شناخت نہیں کر سکتی تھی پھر بھی اتنا تعارف میرے لیے کافی تھا۔

سویر کی سیر میں موسم کی سختی ان کے لیے رکاوٹ نہ بنتی۔ بارش ہوتی تو چھتری

لے کر چلتے، سردی پڑتی تو گرم اونی کپڑوں سے لدے پھندے ہوتے۔ میں سوچتی کاش، ان میں سے ایک کسی دن نہ پہنچے۔ میں دیکھوں کہ اس کی عدم موجودگی میں دوسرے دو گھومنے جاتے ہیں یا پلیا پر بیٹھ کر واپس چلے جاتے ہیں۔ مگر ایسا اتفاق کبھی نہ ہوا۔ ایک انجانی کشش ان تینوں کو وہاں کھینچ لاتی تھی۔

سردیوں کی ایک صبح میری نیند کچھ دیر سے کھلی۔ جس میں دریچے پر پہنچی تو دیکھا چاروں طرف گہرا گہرا چھایا ہوا ہے۔۔۔۔ پلیا کی طرف دیکھا۔ وہاں چند دھندلی پرچھائیاں حرکت کرتی نظر آئیں۔ گھنے کہرے کے سامنے لیمپ پوسٹ کی روشنی ناکافی ثابت ہو رہی تھی۔ مجھے کسی غیر معمولی بات کا احساس ہوا۔ بہت دیر تک نگاہیں ادھر ہی مرکوز کئے رہی۔۔۔۔ اندھیرے سے آنکھیں مانوس ہوئیں تو دیکھا ان میں سے ایک زمین پر گر پڑا ہے اور دوسرے دونوں اسے سنبھال رہے ہیں۔

۔ "یہی موقع ہے ان سے تعارف حاصل کرنے کا۔۔۔۔" میرے دل نے مجھ سے کہا "تو ان کی مدد کو پہنچ"

میں نے دل کا کہا سنا اور ملازموں کو آواز دیتی ہوئی نیچے دوڑی۔ بلدیو اور پیٹر بڑھ کر جا گے۔ جب ہم تینوں پلیا پر پہنچے تو وہ دونوں بے بس نظروں سے ادھر ادھر دیکھ رہے تھے۔ میں نے کہا "چاچاجی! سامنے ہی میرا مکان ہے۔ انہیں وہاں لے چلیں"

انہوں نے اثبات میں سر کو جنبش دی۔ بلدیو اور پیٹر بوڑھے کو اٹھا کر اندر لائے۔ ایک پلنگ پر اسے لٹا کر دو کرسیاں وہیں رکھ دیں۔ وہ دونوں بیٹھ کر فکرمندانہ انداز میں اسے تکنے لگے۔ ڈاکٹر کو فون کر کے میں لوٹی تب بھی تینوں کو اسی حالت میں: یعنی بے ہوش کو بے ہوش اور بقیہ دونوں کو اس کی طرف تکتا پاتا۔۔۔۔ کلف لگے کپڑے پہننے والا بوڑھا تھا وہ جو بے ہوش ہوا تھا۔ میں نے پوچھا۔ تخاطب دونوں سے تھا۔

"کیا یہ بیمار تھے؟" "اچانک بے ہوش کیسے ہو گئے۔"

پینٹ اِسّ شرٹ والے بوڑھے نے جواب دیا۔ "پتہ نہیں، آج بھاؤ صاحب سب سے پہلے پہنچے تھے۔ میں نے ان کندھے پر ہاتھ رکھ کر۔ رام رام، کہا تو نیچے ڈھلک گئے۔ ایک لمحے کے لیے تو میں ڈر ہی گیا۔۔۔۔ مگر خیر ہوئی اسی وقت پاٹل بھی آ گئے۔

"کیوں پائل؟ کل تک تو بھاؤ صاحب اچھے بھلے تھے نا؟"

پائل نے سر ہلا کر ان کی بات کی تائید کی۔ میں نے کچھ یاد کرتے ہوئے کہا۔
"ان کے گھر کا پتہ بتائیے۔ ملازم کو بھیج کر ان کے گھر کے لوگوں کو بلا لیتی ہوں۔"

ان دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ "پتا تو ہمیں معلوم نہیں بیٹی۔ دراصل ہم لوگ ایک دوسرے سے زیادہ واقف نہیں ہیں۔"

ڈاکٹر جین کی آمد سے ہماری گفتگو کا سلسلہ منقطع ہوگیا۔ معائنے کے بعد ڈاکٹر نے کہا، "فکر کی کوئی بات نہیں۔ کمزوری کے باعث غفلت طاری ہوگئی ہے۔ میں ایک انجکشن دے رہا ہوں۔ ہوش میں آجائیں تو ایک گلاس گرم دودھ پینے کو دیں۔"

ڈاکٹر کو رخصت کر کے میں نے بیئرر سے گرم دودھ منگوایا۔ بیئرر دودھ لے کر آیا تب تک انہیں ہوش آگیا۔ حیران حیران نظروں سے مجھے دیکھ کر انہوں نے نحیف آواز میں پوچھا، "میں کہاں ہوں"

میں نے دودھ کا گلاس بڑھاتے ہوئے کہا "پہلے آپ دودھ پی لیں"

انہوں نے ہاتھ سے گلاس پرے کرتے ہوئے کہا۔ "میں وہاں پلیا پر بیٹھا تھا وہاں پائل اور رانا آئے ہوں گے۔"

مجھے تیسرے بوڑھے کا نام بھی معلوم ہوگیا۔ میں نے دل میں کہا "اچھا تو یہ تریمورتی، بھاؤ صاحب، پائل اور رانا کی ہے۔"

پائل اور رانا اٹھ کر ان کے قریب گئے۔ بولے، "ہم یہاں ہیں تمہارے پاس تم پہلے دودھ پی لو۔"

بھاؤ صاحب نے اس بار بغیر کسی ہچکچاہٹ کے دودھ پی لیا پھر لیٹ کر آنکھیں بند کرلیں۔ بیئرر سب کے لیے چائے لے آیا۔ چائے بنا کر دیتے ہوئے میں نے انہیں بتایا کہ میں کئی دنوں سے انہیں سیر کو جاتے دیکھ رہی ہوں۔ مجھے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ وہ لوگ ایک دوسرے سے بہت زیادہ واقف نہیں ہیں۔

انا، بولے بیٹی! جب ہم ایک دوسرے سے متعارف ہوئے تھے اسی وقت ہم نے طے کر لیا تھا کہ ایک دوسرے کے نجی زندگی میں دخیل نہ ہوں گے۔ گھر، بلو زندگی کے علاوہ گفتگو کے ہزارہا دوسرے موضوع ہو سکتے ہیں اس بات کو متفقہ طور پر

ہم تینوں نے تسلیم کر لیا تھا۔" "میں نہیں مانتی چاچاجی" میں نے شوخی سے کہا۔ "گھریلو زندگی ہزار ہا موضوعات پر محیط ہے۔ انسان تمام زندگی اس موضوع پر بولتا رہے تب بھی بہت سی باتیں ان کہی رہ جائیں گی۔" "شاید تم صحیح کہہ رہی ہو بیٹی! یہ میں تھا جس نے تجویز رکھی تھی۔ دراصل میری گھریلو زندگی اتنی زیادہ تکلیف دہ ہے کہ میں کچھ ہی دیر کے لیے کیوں نہ ہو اس تذکرے سے دور رہنا چاہتا تھا۔ پتہ نہیں بھاؤ صاحب اور اتا نے کیوں میری تجویز پر صاد کر دیا تھا۔" پاٹل خجالت آمیز لہجے میں بولے۔

"چاچاجی دکھ من میں چھپا کر رکھنے سے نہیں، دوسروں کے ساتھ بانٹنے سے ہلکا ہوتا ہے۔ ہمیں اپنے دکھ کے بارے میں بتائیے۔ مجھے بیٹی کہا ہے تو بیٹی کی بات نہ ٹالیئے۔"

پاٹل ایک طویل سانس لے کر بولے "عین ممکن ہے کہ دوسروں کو میرا دکھ کوئی بڑا دکھ نہ معلوم ہو مگر میرے لیے وہ پہاڑ جیسا بڑا ہے۔ میں نے اپنی تمام زندگی ایک پیڑ کو خون پسینے سے سینچ کر پروان چڑھانے میں صرف کر دی۔ میں بوڑھا ہوا اور اس پیڑ کے سائے میں، میں نے آرام کرنا چاہا تو دھتکار دیا گیا۔ نہیں سمجھیں تم؟ لو، سیدھے سادے پیرائے میں کہتا ہوں۔ میں ایک معمولی کلرک تھا۔ زندگی بھر روکھی سوکھی کھا کر میں نے اپنے بیٹے کو اعلیٰ تعلیم دلائی۔ انجینیر بنایا اسے۔ پھر دھوم دھام سے اس کی شادی رچائی۔ اب وہ خوش و خرم زندگی گذار رہا ہے۔ اس کے دو بچے ہیں لیکن اس کی زندگی میں میرے لیے کوئی جگہ نہیں رہ گئی ہے۔ سال کے دو جوڑے کپڑے اور دو وقت کے کھانے کے سوا اسے میری کسی ضرورت کا احساس نہیں۔ اس کی بیوی مجھ سے بات نہیں کرتی۔ وہ لوگ اپنے بچوں کو میرے پاس نہیں آنے دیتے۔"

اپنی مٹ میلی بوسیدہ دھوتی کو بائیں پنڈلی پر تھوڑا اوپر کھینچ کر وہ بولے "میرے اس پاؤں میں ایکزیما ہے۔ اس کا بہانہ لے کر بچوں کو مجھ سے دور رکھا جاتا ہے۔ میں نے آج تک اپنے پوتوں کو گود میں نہیں لیا۔"

پاٹل کی آواز بھرا گئی۔

"آپ کی بیوی؟" میں نے پوچھا۔

"ہے. مگر وہ بیٹے بہو کا ساتھ دیتی ہے۔ ان کی طرفداری کرتی ہے۔ کہتی ہے شکر کرو ہمیں گھر سے نہیں نکال دیا گیا۔ اور بیٹے تو بوڑھے ماں باپ کو گھر سے نکال دیا کرتے ہیں۔ شاید وہ ٹھیک کہتی ہے مگر جب میں اپنی عمر کے دوسرے بوڑھوں کو ان کے نواسوں پوتوں کے ساتھ کھیلتا دیکھتا ہوں تو دل بہت ٹوٹتا ہے بیٹی"

اس مرتبہ پائل سبک ہی پڑے۔ بھاؤ صاحب اور انا انہیں ٹکٹکی لگائے دیکھ رہے تھے۔ پائل کو اس بات کا احساس ہوا تو انہوں نے اپنی گیلی آنکھیں دھوتی سے پونچھ کر زبردستی مسکرانے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہوئے۔ آنسو لگاتار بہتے رہے جیسے نشتر لگا دیا گیا ہو اور مدت سے رُکے ہوئے آنسو راہ پاکر رواں ہو گئے ہوں۔

انا نے ان کی طرف سے سب کا دھیان ہٹانے کے لیے کہا "میری کہانی بھی یہ ہے جو پائل کی ہے فرق ہے تو صرف رنگوں کا۔ میری کہانی میں تین رنگ ہیں مگر یہ رنگ آنکھوں کو سکون نہیں بخشتے۔ آنکھوں میں چبھتے ہیں۔ یہ تین رنگ میری تین اولادیں ہیں جن کا ہونا نہ ہونا اب میرے لیے کوئی معنی نہیں رکھتا۔"

"کیوں؟ ایسی کیا بات ہوئی چاچا جی؟" میں نے حیرت سے پوچھا "ابھی بھی کیا ناراضگی؟" "میری کہانی سن لو، خود ہی سمجھ جاؤ گی" انا بولے "میرا ایک بیٹا کناڈا میں ہے اور ایک لڑکی اور ایک لڑکا لندن میں بس گئے ہیں۔ وہاں کی شہریت اختیار کر لی ہے انہوں نے۔ آٹھ برس قبل اپنی ماں کے مرنے پر اس کا انتم سنسکار کرنے آئے تھے۔ میرے مرنے پر بھی آئیں... کیا پتہ؟ شاید نہ بھی آئیں۔ تینوں ہر ماہ مجھے خاصی موٹی رقم بھیج دیتے ہیں جو میں خرچ بھی نہیں کر پاتا۔ نہ وہ یہاں آتے ہیں نہ مجھے وہاں اپنے پاس بلاتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ روپیہ بھیج کر وہ اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو رہے ہیں۔ لیکن تم بتاؤ پائل، کیا روپیہ اولاد کے سکھ سے بڑھ کر ہوتا ہے؟"

انا کی بات مکمل ہوتے نہ ہوتے بھاؤ صاحب پلنگ پر اٹھ کر بیٹھ گئے۔ انا کے ہاتھ تھام کر گلوگیر آواز میں بولے "نہیں دوست نہیں۔ اس سوال کا جواب تو مجھے مانگنا چاہیے تھا۔ مجھ سے پوچھو تو میں کہوں گا کہ اولاد کے سکھ کو دولت سے نہیں تولا جا سکتا۔ مجھے دیکھو، میرے پاس بے اندازہ دولت... مگر میں بے اولاد ہوں۔ اپنی اسے

اولادی کا غم مجھے زندگی بھر کچوٹتا رہا ہے ۔۔ میں اور میری بیوی ہمیشہ اس بات پر تیار رہے کہ کوئی ہماری ساری دولت لے لے اور اس کے عوض ہمیں سنتان سکھ دے دے ۔ ہم سوچا کرتے تھے کہ آج ہمارا بیٹا ہوتا تو ہمارے لیے یہ کر ناوہ کرتا۔ ہماری بیٹی ہوتی تو سسرال میں جاکر ہمارا نام روشن کرتی ۔ ۔ ۔ ۔ کیا کیا نہ سوچتے رہے ہم! اولاد کے خواب کتنے نہ دیکھے ہم نے! مگر اب تم دونوں کی کہانیاں سن کر مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ تمہارے سامنے میرا دکھ کچھ بھی نہیں۔ پاکر کھو دینے کا دکھ نہ ہونے کے دکھ سے کہیں بڑا ہوتا ہے۔ چلوں! اپنی بیوی کو اس بات کی سچائی سے واقف کراؤں ۔۔۔

نہایت پھرتی سے اٹھ کر بھاؤ صاحب دروازے کی طرف بڑھے۔ پائل اور انا ان کے پیچھے تھے۔

وہ تینوں ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے آگے بڑھ رہے تھے۔ ان کی پشت پر نظریں جمائے میں دل ہی دل میں تہیہ کر رہی تھی کہ کل سے ان تینوں بوڑھوں کو تماشہ سمجھ کر ہرگز نہیں دیکھوں گی ۔۔ جب قیدیوں ہی کو دیکھنا ٹھہرا تو اپنے جال میں قید ان بوڑھوں کو دیکھنے سے ہتھکڑیوں سے بندھے ان قاتلوں ان چور ڈاکوؤں کو دیکھنا بھلا ۔!!۔

"بدامی او بدامی! اٹھ جلدی۔"
پنچانن نے سڑک پر سے پکارنا شروع کر دیا تھا۔ مگر بدامی کو ہوش ہوتا تب ہی تو سنتی پنچانن نے ٹھوکر مار کر دروازے کی ٹٹی ہٹائی تب پہلی مرتبہ بدامی کو اُس کی آواز سنائی دی۔ پھٹے بانس کی سی آواز، جو شراب کے نشے سے کچھ اور اونچی کچھ اور کرخت ہو گئی تھی۔

بدامی کے جسم کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ آنکھوں کے پپوٹے بوجھل ہو رہے تھے۔ بڑی مشکل سے اس نے آنکھوں کو ذرا سا کھول کر دیکھا۔ نشے میں دُھت پنچانن ایک ہاتھ میں ایک مرغا اور دوسرے ہاتھ میں شراب کی بوتل لیے اس کے سر پر کھڑا تھا۔ بدامی کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ ہونٹ دانتوں میں دبا کر اس نے کسی طرح اپنے غصے کو قابو میں کیا آنکھیں بند کر لیں پھر دیوار کی طرف منھ پھیر لیا۔

"بدامی.... سالی سُن رہی ہے یا نہیں چل اٹھ کر کوٹرا پکا۔ سب سامان لایا ہوں۔ بلرام بھی آوے گا۔ دوسری بوتل لانے گیا ہے۔"

بدامی خاموش رہی۔ پنچانن کا غصہ آسمان کو چھونے لگا۔

"ٹھہر سالی بتاتا ہوں تجھے!" کہہ کر پنچانن نے بوتل ایک طرف رکھ دی۔ دیوار سے ٹوکری اتار کر مرغا اس کے نیچے بند کیا پھر بڑ بڑانے لگا۔ "سالی کو سانپ سونگھ گیا ہے۔

ہاں ہنیں تو.... سالا ایک تو آج کتنے دنوں بعد خیرو بھائی کا کو مرا ہاتھ لگا ہے.... اور ادھر اس حرام زادی کو نخرے سوجھ رہے ہیں.... یہ پکا کر نہیں دے گی تو کو مرا کھانے کا کیا اس کی سوتن کے گھر جاؤں گا۔ تو اٹھتی ہے یا نہیں ؟"

اس نے بدامی کے نزدیک پہنچ کر اسے ٹھوکر لگائی۔

بدامی اسی طرح پڑی رہی آج حقیقتاً وہ بیمار تھی۔ بخار سے اس کا تمام جسم پکے پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا ورنہ یہ گالی گلوج اور یہ حیوانی سلوک اس کے لیے کوئی نئی بات نہ تھی ،، پنچانن تمام دن آوارہ گردی کرتا۔ شراب خریدنے بھر کی کمائی ہوتی نہیں کہ پیٹ کے جہنم کو داروسے بھر کر رات گئے گھر لوٹتا۔ پاؤ بھر گوشت یا مچھلی ساتھ لاتا۔ موقع ملنے پر کسی کا مرغا مرغی پار کرنے سے نہ چوکتا۔

بدامی کو اس کا ایک پیسے کا سہارا نہ تھا۔ برخلاف اس کے پنچانن ہی اسے نوچ کھسوٹ کر اس کے چھپائے روپئے نکال لےجاتا۔ آج وہ خیرو بھائی کا مرغا چرالایا ہے کمبخت ،احسان فراموش ہے نمبر ایک کا۔ بھیما ،بدامی کا بیٹا گذشتہ دنوں لقمۂ اجل ہوجاتا اگر خیرو بھائی نے بروقت مدد نہ کی نہ ہوتی۔ اپنے رکشہ میں ڈال کر انہوں نے بھیما کو اسپتال ،، پہنچایا تھا۔ دوائیں خریدی تھیں اور رات بھر اس کے ساتھ اسپتال میں بیٹھے رہے تھے اس پنچانن کو تو رات گھر لوٹنے پر بھیما کی علالت کی خبر ملی تھی تو وہ اسپتال کی سمت چلا بھی تھا مگر نشے کی زیادتی سے راستے ہی میں لڑھک گیا تھا۔

"بدامی!!" پنچانن نے حلق پھاڑ کر گالی بکی پھر اسے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ بدامی نے اپنے غصّے پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "آج مجھ سے مت بولو جی " میرا جی اچھا نہیں ہے۔ بخار بھی ہے "

"کھا کھا کر مٹا رہی ہے سالی اور کہتی ہے جی اچھا نہیں ہے،" پنچانن جھلّا کر چلایا " مجھے بھوک لگ رہی ہے۔ کھانا کیا تیری ماں آکر پکائے گی ؟" زیادہ نخرے نہ دکھا ورنہ مار مار کر بھرکس نکال دوں گا،،

پنچانن نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے زمین سے آدھا اوپر اٹھا دیا۔ چار و ناچار بدامی کو اٹھ کر کھڑا ہونا پڑا۔ آنکھیں پھاڑ کر اس نے پنچانن کو دیکھا۔ تین برس ہوئے اس شخص سے اس کی شادی ہوئے تین لمحوں کا بھی سکھ اس نے نہیں پایا۔ روزمرہ کی لڑائی، گالی گلوج

مار پیٹ ہی اس کی زندگی بن گئی تھی۔

بھیما کی پیدائش سے کچھ دیر پہلے تک اس نے بدامی کو لاتوں گھونسوں سے مارا تھا۔ گوشت پکاتے پکاتے اٹھ کر وہ فراغت حاصل کرنے میدان میں گئی تھی اور درد کی ایک تیز لہر اٹھنے پر وہیں ڈھیر ہو گئی تھی۔ ادھر گوشت جل گیا تھا۔ جلنے کی بو پھیلنے پر پنچانن اسے تلاش کرتا ہوا وہاں پہنچا تھا۔ اس کی تکلیف اس کے درد کا احساس تو کجا، گوشت جلا دینے کے جرم کی پاداش میں اسے پیٹنا شروع کر دیا تھا۔ اسی مار پیٹ کے دوران بھیما نے جنم لے لیا تھا۔

"حرامزادی! کیا کھڑی کھڑی مر گئی؟" پنچانن نے اسے جھنجھوڑا۔

"پرے ہٹ!" بدامی نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ پنچانن نشے میں دھت تھا۔ بدامی کے دھکے سے زمین پر گر پڑا۔ اس کے منھ سے گالیوں کی بوچھار نکلی۔ بدامی اور بدامی کے ماں باپ اور اس کے سارے خاندان کو گالیاں بکتا ہوا پنچانن کہنیوں کے بل اٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔

بدامی کا بخار اس کے دماغ پر چڑھ گیا۔ وہ ہوش کھو بیٹھی۔ اس کی آنکھوں میں وہ منظر گھوم گیا جب وہ درد زدہ سے چھٹپٹا رہی تھی، پنچانن اسے مار رہا تھا اور بھیما کا جنم ہو رہا تھا..... وہ مشتعل ہو گئی۔ ایک تیز غراہٹ کے ساتھ پنچانن پر پل پڑی۔ لات گھونسے، تھپیڑ برسانے لگی۔ پھر بھی اسے تسکین نہ ہوئی تو شراب کی بوتل اٹھا کر مسالہ پیسنے کی سل پر پٹخ کر توڑ دی۔ ایک ٹھوکر ٹوکری میں ماری۔ ٹوکری الٹ گئی۔ مرغا اس کے نیچے سے نکل کر کھلے دروازے سے باہر بھاگا۔

آج مورے بالما تیرا انتظار ہے .... جیا بے قرار ہے

اچانک دور سے ہوا کے دوش پر تیرتا ہوا بلرام کی بھونڈی آواز میں یہ گیت بدامی کو سنائی دیا۔ یقیناً وہ بوتل لے کر دعوت کے تصور میں مگن لوٹ رہا تھا۔ لپک کر بدامی نے چراغ بجھا دیا۔ کواڑ کی ٹٹی لگائی اور اس سے پشت ٹیک کر بیٹھ گئی۔ بلرام نے دروازے پر آ کر پنچانن کو متعدد مرتبہ پکارا پھر بکتا جھکتا واپس چلا گیا۔

کتنی ہی دیر تک بدامی ہر قسم کے احساس سے بے نیاز بیٹھی رہی۔ دھیرے دھیرے اس کے حواس لوٹے تو اسے حالات کی سنگینی کا احساس ہوا۔ کیا کر بیٹھی ہے

وہ؟ پنچانن پر ہاتھ اٹھایا ہے۔ پنچانن ہوش میں آنے پر اسے زندہ چھوڑے گا. شرابی ہوا تو کیا ہوا؟ ہے تو مرد! مرد کو اپنی برتری کا ہمیشہ احساس رہتا ہے۔ وہ یہ کبھی برداشت نہ کر سکے گا کہ کوئی عورت اس پر ہاتھ اٹھانے کے بعد زندہ رہے . . . . اسے مزہ چکھا کر رہے گا وہ۔ کیا کرے اب بدامی! کیا خودکشی کر لے؟ مگر بھیما کا کیا ہوگا؟ بھیما کے لیئے اسے ہر حال میں جینا ہوگا۔ اسے اپنے باپو کے پاس لوٹ جانا چاہیئے ورنہ ہوش میں آتے ہی پنچانن اس کا گلا دبا دے گا۔

اس عزم کے ساتھ بدامی اٹھی اندھیرے میں ٹٹول ٹٹول کر اس نے اپنے اور بھیما کے کپڑے گٹھری میں باندھے پھر بھیما کو گود میں اٹھانے کے لیے بڑھی ہی تھی کہ ایک نئے خیال نے اس کے قدم روک لیے۔ پنچانن اگر جلد ہی ہوش میں آ گیا اور اس نے اسٹیشن پر آ کر اسے پکڑ لیا تو؟ پسنجر گاڑی جانے میں ابھی دو گھنٹے کی تاخیر ہے۔ تب وہ کیا کرے جس سے پنچانن اس کا تعاقب نہ کرنے پائے . . . . گٹھری اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر پڑی۔ خوف کا ایک زبردست حملہ اس پر ہوا۔

شادی کے دو ماہ بعد کا ایک واقعہ ذہن کے کسی گوشے سے رینگ کر اس کے سامنے آ گیا۔ اس روز پنچانن نے اسے اس بری طرح زدوکوب کیا تھا کہ بدامی نے اسے چھوڑ کر مائیکے جانے کا تہیہ کر لیا۔ "کمینے کتّے جانور! میں بھر پائی تیرے سے! میں اپنے باپو کے پاس جا رہی ہوں" وہ خون تھوکتی ہوئی نفرت سے بولی تھی۔

"جا کے تو دیکھ! ٹانگیں نہ توڑ دوں تیری! تو نے گھر سے قدم نکالا اور میں نے تیری بوٹیاں کر کے چیل کوؤں کو کھلائیں" پنچانن نے اسے دھمکایا تھا۔

بدامی کہیں سچ مچ اپنے باپو کے پاس چلی نہ جائے اس اندیشے سے پنچانن نے کوئی انتظام کر لینا بہتر سمجھا۔ تین روز تک گھر سے باہر جاتے ہوئے وہ بدامی کے ہاتھ پاؤں باندھ کر منھ میں پٹی باندھ جاتا تاکہ نہ وہ بھاگ سکے نہ چیخ کر کسی کو مدد کے لیے بلا سکے۔ بدامی کو ہتھیار ڈالنے پڑے تھے۔ پنچانن کے پاؤں پکڑ کر اس نے معافی مانگی تھی تب کہیں جا کر اس کی گلوخلاصی ہوئی تھی۔

— وہ بھی آج یہی طریقہ اپنائے گی، آج ایک ساتھ تمام حساب صاف کر لے گی . . . . اسی طریقے سے پنچانن کو اپنے پیچھے آنے سے روکے گی جیسے کبھی اس نے بدامی کو روکا تھا

بدامی نے کسی طرح گھسیٹ کر پنچانن کو چارپائی پر ڈالا، چارپائی کے ڈنڈوں سے اس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر منھ میں کپڑا ٹھونسا اور بھیما کو گود میں لے کر اسٹیشن کی طرف دوڑ گئی۔

ٹرین میں بیٹھ جانے کے بعد اس پر نیند کا غلبہ ہوا، مگر ذرا دیر کو اس کی آنکھ لگتی کہ پنچانن راکشش کی طرح اس پر چڑھ دوڑتا دکھائی دیتا اور وہ پسینہ پسینہ ہو کر جاگ اٹھتی۔ یہ تو ممکن ہی نہیں تھا کہ پنچانن جو کچھ ہوا اسے فراموش کر جاتا۔ وہ اس سے بدلہ ضرور لے گا.... اس کا بوڑھا باپو کیا پنچانن سے اس کی حفاظت کرنے میں کامیاب ہو سکے گا؟.... یقیناً ہی نہیں۔ تب وہ گاؤں جاکر کیا کرے گی۔ اس سے غلطی ہوئی۔ اسے پنچانن کو جیتا نہ چھوڑنا چاہیئے تھا۔ ایک بار مار ہی ڈالتی تو زندگی بھر کا پاپ کٹ جاتا۔ وہ زندگی بھی کوئی زندگی ہے جو پنچانن کے خوف کے سایے میں بسر ہو۔

بدامی کے گاؤں کا اسٹیشن آیا اور گذر گیا اس نے کسی انجان مقام پر جاکر رہنے کا طے کر لیا تھا.... کوئی ایسا مقام جہاں پنچانن اس تک نہ پہنچ سکے۔ پہلے وہ مزدوری کر کے اپنا اور اپنے بچے کا پیٹ بھرتی تھی اب بھی محنت مزدوری کر کے زندگی گذار لے گی۔

دو مہینوں تک بدامی ادھر ادھر چھپتی پھری۔ پنچانن کا خوف اس کے دل سے جاتا نہ تھا۔ دس پندرہ روز سے زیادہ کہیں ٹکتی نہ تھی کہ مبادا پنچانن اس کا پتہ پالے۔

ایک روز وہ ناگپور کے اسٹیشن پر اتری تو اسے خیال آیا اس کے کاکا کی ایک لڑکی پاس ہی کے ایک گاؤں میں بیاہی ہے۔ وہ تارا کے گھر پہنچی۔ تارا اور اس کے شوہر اودھو کو اپنی بپتی سنا کر مدد کی طالب ہوئی۔

ان دونوں نے اس کی ہر ممکن مدد کی۔ اس کے لیے علاحدہ جھونپڑی بنا دی۔ تارا کے ساتھ وہ کھیتوں میں کام کرنے لگی.... یہاں وہ کافی محفوظ تھی۔ چار ماہ بعد جب پنچانن کا خوف اس کے ذہن سے معدوم ہو گیا تھا.... وہ اچانک ایک دن اس کے سامنے آ پہنچا۔

سانولا سجیلا، داڑھی مونچھ سے بے نیاز چہرہ، گھنے کالے بال تیل سے چیڑے ہوئے صاف دھلا ہوا کرتا پاجامہ زیب تن کئے ایک جوان اس کے سامنے کھڑا تھا۔ پہلے تو بدامی اسے پہچان ہی نہیں پائی پھر اچانک ایک کوندا سا اس کے ذہن میں لپکا۔

پنچانن! پنچانن ہے یہ!۔
پنچانن کو گنجی بے ترتیب داڑھی اور میلے چیکٹ لباس میں دیکھنے کی عادی بدامی کو اسے شناخت کرنے میں تامل ہوا تھا مگر تھا وہ پنچانن ہی۔
"تو.... تو یہاں کیسے پہنچ گیا؟" زرد پتے کی طرح کانپتی ہوئی بدامی نے پوچھا اور پھر جواب کا انتظار کیے بغیر بچاو.... بچاؤ" کی صدائیں بلند کرتی ہوئی بھاگی۔
"بدامی!.... سن بدامی" پنچانن نے اسے روکنا چاہا مگر جانے پہچانے راستے پر ہرن کی مانند قلانچیں بھرتی ہوئی بدامی نے تارا کے صحن میں پہنچ کر ہی دم لیا۔ ہانپتی ہوئی وہ اودھو سے بولی۔ "وہ آگیا.... بھائی مجھے بچا۔"
تارا کے سنبھالتے سنبھالتے بھی بدامی بے ہوش ہو گئی۔ تب تک پنچانن وہاں پہنچ چکا تھا۔
"تم پنچانن ہو؟ کیوں آئے ہو؟" چھ فٹا اودھو ڈھال بن کر بدامی کے سامنے کھڑا ہو گیا۔
پنچانن گھگھیا کر بولا "بدامی کو لینے آیا ہوں۔ دادا.... میں نے شراب پینی چھوڑ دی ہے۔ اس دن بدامی نے میرے ساتھ جو کیا اچھا کیا۔ میری آنکھیں کھول دیں اس نے۔ میں شام تک بندھا پڑا رہا۔ جب بلرام نے مجھے دارو کی بھٹی پر نہ پایا تو کھوج کی۔ گھر آیا میرے ہاتھ پاؤں کھولے.... سارے گاؤں میں اس نے بات پھیلادی۔ گاؤں والے بولے "لات مارو ایسی جورو پر، جو مرد پر ہاتھ اٹھاتی ہے بلرام نے بھی کہا۔ "چلو اس کو مار کر گاڑ دیتے ہیں مگر دادا۔ مجھے بدامی نہیں بھولتی تھی...."
"بدامی یہاں اس گاؤں میں ہے.... اس کی خبر تجھے کس نے دی؟" اودھو نے مشتبہ نظروں سے اسے گھور کر پوچھا۔
پنچانن نے کہا "میں روز روز جاکر بدامی کے باپو کے پاؤں پڑتا تھا کہ بتاؤ بدامی کہاں جا سکتی ہے؟ باپو جھڑک دیتا تھا مجھے.... مگر ایک دن اسے مجھ پر دیا آہی گئی۔ اپنے سب سے سمبندھیوں کے پتے اس نے مجھے بتادئے۔ لوہ گاؤں

کنیرا، بھیما، گرڑھی، بارامائی سب استھان دیکھ آیا ہوں... پنچانن نے اودھو کے چاؤں پکڑ لیے اور روتا ہوا بولا... "تمہارے پاؤں پڑتا ہوں دادا، بدامی کو میرے ساتھ کر دو۔ میں اب بدل گیا ہوں۔ بالکل بدل گیا ہوں۔ سب بڑی عادتیں میں نے چھوڑ دی ہیں۔ میں محنت مجوری کروں گا مگر بدامی کو رانی بنا کر رکھوں گا۔"

تارا کی گود میں نیم بے ہوشی کے عالم میں لیٹی بدامی کو، منت سماجت کرتے پنچانن پر بڑی یاد آئی.... "کیسی چروری کر رہا ہے اُودھو دادا کی.... وہ بھی کیسی مورکھ ہے کہ ایسے بھلے مانس کو نہیں پہچان پائی.... اپنے کرم خراب کر بیٹھی۔ اس نے پاپ کیا جو پنچانن پر ہاتھ اٹھایا۔ وہ تو دیوتا آدمی ہے۔"

عورت

اف فوہ! میری بات تو سنو نرس!
تم مجھے فلرٹ تو نہیں سمجھ رہیں؟ ذرا سوچو کیا اب میری عمر رہ گئی ہے عشق لڑانے کی؟ ہاں ایک وقت تھا جب میری عشقیہ شاعری مشاعرے لوٹ لیتی تھی۔ حسینائیں میرے شعر گنگنا کر مجھ سے آٹو گراف مانگا کرتی تھیں ..... نہیں، اسے مذاق نہ سمجھو نرس! میں مشاعروں کا شاعر بھی تھا تو شاعر۔ دور کیوں جاؤ۔ ابھی دو برس پہلے تک میری سپید داڑھی، سفید بال اور جھکی کمر، میری شخصیت کو پروقار ہی بناتے تھے۔ میرے مصنوعی دانتوں سے پھوٹتے ہوئے الفاظ اور میرے عاشقانہ شعر سن کر لوگ جھوم جایا کرتے تھے۔ بھلے ہی پیٹھ پیچھے کہتے ہوں (بلکہ کہتے بھی تھے) کہ بوڑھا بڑا رنگین مزاج ہے، پیٹھ پیچھے تو لوگ راجہ کو بھی گالیاں دیتے ہیں۔ میں کس کھیت کی مولی ہوں؟ ہاتھی جب بازار میں چلتا ہے تو ہزار کتے اس پر بھونکتے ہیں مگر کیا بگاڑ لیتے ہیں اُس کا؟۔

ہاں تو میں کیا کہہ رہا تھا..... کہہ رہا تھا کہ میں نے بے حد رنگین زندگی گذاری ہے تم جا رہی ہو نرس، تم چلی گئیں؟ اب میں کس سے بات کروں؟ اپنے دِل کا بوجھ کیوں کر ہلکا کروں سنو اے ہواؤ! اے پیڑ پودو سنو جو میں کہتا ہوں میری باتوں کو دیوانے کی بڑ نہ سمجھو۔ دیوانے کبھی کبھی پتے کی بات کہہ جاتے ہیں۔ میں

نے برسوں شاہانہ ٹھاٹ کیے ہیں۔ عیش و آرام کی زندگی بسر کی ہے۔ خوشحالی اور خوش بختی، میرے قدم چومتی رہی ہے.... میں نے جو چاہا حاصل کیا ہے....

'عزت و احترام'؟

یہ کون بولا؟ نرس تم کب آئیں؟ اوہ تم پھر انجکشن تیار کر رہی ہو۔ مجھے انجکشن سے ڈر لگتا ہے نرس! لوگ کہتے ہیں میں نے اپنے دورِ اقتدار میں کتنے ہی دلوں کو چھلنی کیا ہے آہ! اف! کتنے نازک ہیں تمہارے ہاتھ، مگر کتنی بے رحمی سے سوئی چبھوتی ہو۔ لوگ میرے بارے میں یہ بھی کہتے تھے کہ میں میٹھا بول کر پیٹھ میں چھری گھونپنے کا عادی ہوں۔ سننے والے کی پشت میری طرف ہوتے ہی میں اپنی بات سے پلٹ جاتا تھا.... کہنے دو لوگوں کا کام ہے کہنا۔ مگر تم نے ابھی دبے لفظوں میں کیا کہا تھا؟ مجھے زندگی میں عزت و احترام ملا یا نہیں۔ یہی پوچھا تھا نہ تم نے؟ چھوڑو بھی یہ عزت وزت کی باتیں۔ یہ انسان کو بلند مقام چاہے دلا دیتی ہوں۔ پیٹ کی آگ تو شانت نہیں کرتیں۔ کار، بنگلہ اور لاکھوں روپئے کی ماہانہ آمدنی کا ذریعہ تو نہیں بنتیں۔ ایمانداری سے ترقی کرنے والا ترشنکو کی طرح درمیان میں لٹکا رہ جاتا ہے۔ نیچے بے ایمانی کی پستی میں گر سکتا ہے نہ اوپر اٹھ کر عیش و آرام کے سامان حاصل کر سکتا ہے۔ اسے یہ فن.... میرا مطلب ہے ہر ممکن ذرائع کا استعمال کر کے کچھ بننے کا فن آتا ہی نہیں۔ ڈاکٹر شمیم ہی کی مثال لے لو۔ میرے ساتھ سروس میں لگا.... میرے ساتھ ریٹائر ہوا مکان بنا یا.... مگر صرف تین کمروں کا لڑکا ضرور ہی اس کا ہونہار نکلا۔ ہارورڈ یونیورسٹی سے ڈگری لینے گیا ہے۔ میرے بیٹے کسی سے کم ہیں کیا؟ آخر کو میرے بیٹے ہیں۔ میرے تجربات میری دنیا فہمی کا فائدہ تو انہیں ہونا ہی تھا۔ تینوں ہمیشہ تھرڈ کلاس اسٹوڈنٹ رہے مگر آج زندگی کی دوڑ میں فرسٹ نمبر پر بھاگ رہے ہیں۔ ہنستی ہے نرس! میرے تین بیٹے ہیں۔ تینوں ڈاکٹر ہیں۔ ایک انسانوں کا ڈاکٹر ہے۔ دوسرا جانوروں کا ڈاکٹر.... تیسرا ادب کا ڈاکٹر — نہیں غلط نہ سمجھو۔ انہوں نے جو مجھے یہاں ڈال دیا ہے تو اس میں ان کی کوئی مجبوری ہوگی وہ میرے نقشِ قدم پر چل رہے ہیں۔ میں نے انہیں سکھایا ہے کہ جہاں سے کچھ ملتا ہو وہاں سے تعلق رکھو۔ جس سے کچھ فائدہ ہوتا ہو اسی سے سروکار رکھو.... اس کے لیے چاہے گدھے کو باپ کہنا پڑے۔ یا باپ کو گدھا.... کہو.... اب میں انہیں الزام دوں تو کیسے — وہ تو کہو نرس کہ خدا نے مجھے بیٹیاں نہیں دیں ورنہ انہیں بھی میں ڈاکٹر بناتا —

داخلے میں مشکلات انہیں پیش آتی ہیں جن کا رسوخ نہیں ہوتا۔ جن کے پاس پونجی نہیں ہوتی۔ مجھ سے کوئی کہتا تو میں بیلوں، گدھوں کا بھی میڈیکل کالج میں داخلہ کروا دیتا۔ ہاں، میں کہہ رہا تھا کہ میرا بڑا بیٹا ڈاکٹر بنا تو میں نے مین گیٹ پر اپنے نام کے ساتھ اس کے نام کی تختی بھی لگا دی۔ پھر دوسرے بیٹے کے نام کی اور پھر تیسرے بیٹے کے نام کی بھی تختیاں لگیں تو وہ کمبخت شمیم ایک روز بولا۔ "چار چار ڈاکٹروں کی نیم پلیٹیں لگانے سے بہتر ایک تختی لگا دیتے جس پر دواخانہ لکھا ہوتا۔" وہ کیا سمجھے نادان! چار چار تختیاں دیکھ کر راستہ چلتوں پر کیسا رعب پڑتا ہے۔؟

شمیم میں اتنی سمجھ داری ہوتی، اسے دنیاداری آتی ہوتی تو مجھ سے میلوں پیچھے نہ چھوٹ جاتا۔ ہماری تعلیم ساتھ ہوئی۔ یہ اور بات ہے کہ اسکولی امتحانات میں اول وہ آتا رہا، بورڈ کے امتحان میں امتیاز میں نے حاصل کیا۔ اونچی چھلانگ لگانے کا گر ایک مرتبہ میں نے سیکھا تو میری چھلانگیں اونچی ہوتی چلی گئیں۔ تم بور ہو رہی ہو نرس! لو میں اپنی بات کو دلچسپ پیرائے میں بیان کرتا ہوں۔ تم نے کھلاڑیوں کو اونچی چھلانگ لگاتے دیکھا ہے؟ دوڑتے ہوئے آکر بانس کا ایک سرا زمین پر ٹکا کر پلک جھپکنے میں اوپر اٹھ جاتے ہیں۔ یاد رہ جاتا ہے ان کا اونچا اٹھنا...... اونچے اٹھنے کا وہ لمحہ، وہ پل جیسے آنکھوں میں جم کر رہ جاتا ہے — میں نے ایم۔ اے میں گولڈ میڈل حاصل کیا تو یہ شمیم غم کھا گیا۔ ویسے سچ کہوں، آج مجھے وہ بات یاد آتی ہے تو شمیم سے ہمدردی ہوتی ہے۔ پورے بہتر نمبر اس کے زیادہ تھے درمیان میں چار لڑکے اور تھے مگر میں نے چاندی کے ڈنڈے کے سہارے چھلانگ لگائی اور چھوڑ گیا سب کو پیچھے...... سب کو پیچھے۔ ایک گلاس پانی دو نرس! کیا کہا؟ نہ بولوں اب؟ بولوں نہیں تو کیا کروں؟ ہاں پانی پی کر اب کچھ سکون ملا ہے۔ گلا سوکھ رہا تھا تم نے کیا کہا نرس؟ کچھ کہے نہیں! میں نے صاف سنا ہے..... دیکھا بھی ہے، تم نے بیوی کہہ کر منہ ٹیڑھا کیا ہے۔ آہ! فیل تو مجھے بھی ہوتا ہے! وہ مجھے نظرانداز کرنے لگی ہے۔ اس مرتبہ تین دن ہو گئے وہ آئی نہیں ہے اسی لیے تو میرا دل بھر آیا ہے اور میں نے تم سے بات کر کے دل کا بوجھ ہلکا کر رہا ہوں وہ لگی ہوگی بہو کی خوشامد میں۔ بڑھاپے میں آدمی کے سٹھیانے کی وجہ یہی ہے کہ سب اسے عضو معطل سمجھ کر دور کر دیتے ہیں۔ بوڑھے کی بڑبڑ سننے کی فرصت کسے ہوتی ہے؟ سنے تو کون سنے؟ جنم جنم تک ساتھ دینے کا دعویٰ

کرنے والی بیوی بھی وقت کی طرح نگاہیں پھیر لیتی ہے زمانہ ایک سی چال چلتا تو میری بیوی مجھے پاگل سمجھتی؟ ہرگز نہیں..... میں نے اسے رانی سا راج کرایا ہے۔ دنیا کے عیش و آرام اس کے قدموں میں ڈال دئے ہیں۔ ورنہ کیا وہ اس کی اہل تھی؟ جب وہ دلہن بن کر آئی تھی بالکل گنوار اور ان پڑھ تھی۔ میں بنا بنیا گڑ بھوت ہوا تھا۔ زمانے کی ہوا اس وقت تک مجھے نہیں لگی تھی مگر مٹی کا مادھو تو میں نہیں تھا..... ایک بات بتاؤں..... نہیں تم سن کر ہنسو گی..... مجھے خود ہنسی آتی ہے کہ جو پہلے مجھ پر ہنستے تھے وہ میرے سامنے جھک گئے۔ انہیں جھکنا پڑا۔ میں نے انہیں جھکنے پر مجبور کر دیا۔ نہیں، میں بات نہیں اڑا رہا ہوں۔ سنو۔ مومن پورہ کے لونڈے میرا مذاق اڑاتے تھے۔ میری چڑ نکال رکھی تھی انہوں نے۔ میں گذرتا تو آوازے کستے۔ کہتے دگر بھر کی تیری رومالی..... رک..... رک اے موالی..... دیکھ ہے آگے اک نالی..... میرے علی گڈھی پاجامے اور دائمی نزلے پر ہوتی تھی یہ پھبتی! میں خون کے گھونٹ پی کر رہ جاتا تھا۔ مگر جانتی ہو نرس! میں نے پتہ چلا لیا تھا کہ یہ تک بندی کس نے کی تھی؟ غفور بھائی کا یہ لونڈا جب ایم۔ اے میں بیٹھا تو تین سال تک میں نے اسے پاس نہیں ہونے دیا۔ میں تو اسے فیل کر کے ہی مطمئن تھا مگر ایک دن جب وہ مجھ سے نہ صرف معافی کا طلب گار ہوا بلکہ اس نے معقول نذرانہ بھی پیش کیا تو میرے ہاتھ جیسے پارس پتھر لگ گیا۔ میں نے اسے گولڈ میڈل دلایا اور پارس پتھر سے دولت کمانے لگا۔ ہاں خوب یاد دلایا نرس۔ میں اپنی بیوی کی بات کر رہا تھا۔ میں نے اپنا شہر چھوڑ دیا کیونکہ میں نے سن رکھا تھا کہ وہ پھول سر چڑھا جو چمن سے نکل گیا میرے شہر کے لوگ نہایت جاہل اور فرسودہ رسم و رواج کے پابند تھے۔ وہ میری قدر کیا کرتے؟ نئے شہر میں مجھے یونیورسٹی میں ملازمت مل گئی اور پھر میں نے پیچھے پلٹ کر نہیں دیکھا۔ آگے بڑھتا گیا۔ میں نے اپنا رہن، سہن، حلیہ، لباس سب بدل دیا۔ علی گڑھی پاجامہ چھوڑ۔ چست پاجامہ اور شیروانی پہننے لگا۔ داڑھی بڑھا لی کیونکہ میں شاعر بھی بن گیا تھا۔ یقین کرو نرس! جوانی میں میں بالکل پنڈت نہرو جیسا لگتا تھا۔ نہیں اس وقت مجھے دیکھ کر مذاق نہ اڑاؤ میرا۔ بس گلاب کے ایک پھول کی کسر رہ جاتی تھی۔ ورنہ لوگوں کا دھوکا کھا جانا یقینی ہوتا..... میری بیوی جو معمولی سے اسکول ٹیچر کی بیوی بن کر میرے گھر آئی تھی اب ایک مشہور اور عزت دار شخص کی شریک حیات کہلانے لگی تھی۔ ہاں تمہیں کہنے کا حق ہے۔ جسے میں نے زندگی کا ہر سکھ دیا وہ مجھ سے کیوں نظریں

پھیر گئی؟ دراصل اب وہ اپنے بیٹوں کی نظرِ کرم کی محتاج ہے۔ بہوؤں کی خوشنودی کی خاطر مجھے نظرانداز کرتی ہے۔ یہی دنیا کی ریت ہے شاید!

تم بور تو نہیں ہو رہیں نرس! مجھے بچپن سے باتیں بنانے اور باتیں کرنے کا شوق ہے۔ میں ہمیشہ چار لوگوں میں گھرا رہنا پسند کرتا تھا۔ آج بھی یہی چاہتا ہوں۔ . . .

مگر...... خیر چھوڑو۔ تمہاری دلچسپی کے لیے ایک مزے دار واقعہ سناتا ہوں۔ اسی شہر کا ایک عیاش شخص ایک مرتبہ میرے پاس آیا۔ میں تمہیں یہ بتانا بھول ہی گیا کہ کچھ ہی برسوں میں ترقی کر کے میں ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ بن گیا تھا۔ بس دو حریفوں میں سے ایک کو طویل عرصے کے لیے اسپتال نہ بھیج کر دوسرے کو بدکرداری کی بنا پر نااہل ثابت کرنا پڑا تھا۔ صدر شعبہ بنتے ہی بس سمجھ لو کہ یونیورسٹی کے اپنے اس ڈیپارٹمنٹ کی بساط میں نے اپنے سامنے بچھالی۔ دونوں طرف سے بازی میں ہی کھیلنے لگا۔ جب جی چاہتا جس مہرے کو جی چاہتا پٹوا دیتا۔ کبھی بات بنتی نظر نہ آتی تو پوری بازی الٹ دیتا... اس کھوسٹ عیاش شخص کے لیے بساط ہی الٹنی پڑی تھی۔ وضع قطع اس نے شریفوں کی سی بنا رکھی تھی۔ نام بھی شریفوں کا سا تھا۔ عبداللہ۔ بولا.... "اس نمبر کو گولڈ میڈل دلانا ہے چٹ پر لکھا نمبر میرے آگے رکھتا ہوا وہ بولا تھا۔ میں نے کاپی دیکھی "پوچھا" "کوئی" لڑکی ہے؟"

کہا۔ "ہاں"

کتنی عجیب بات ہے نرس کہ زیادہ تر سفارشیں لڑکیوں ہی کے لیے ہوتی ہیں۔

خیر.... میں نے دوبارہ پوچھا۔

"آپ کی بیٹی ہے؟"

"نہیں"

"بیوی؟"

"نہیں"

"بہن؟"

"نہیں"

"کوئی رشتہ دار؟"

"نہیں، نہیں"

میں بھی ٹھہرا ایک خرانٹ! بڑے میاں کے بغلیں جھانکنے سے سمجھ گیا کہ سماج میں جو قابل قبول ہو ایسا کوئی رشتہ ان میں نہیں ہے۔۔۔۔ انہیں دوسرے روز آنے کے لیے کہہ دیا۔ اس دوران تفتیش کی تو پتہ چلا کہ بڑے میاں کی جوان اولاد ہیں ہیں پھر ایک داشتہ رکھے ہوئے ہیں۔ یہ عورت طلاق یافتہ ہے۔۔۔۔ جہاں رہتی دو چار عاشق بنا لیتی۔ شوہر نے آوارگی پر ہمیشہ لگانی چاہی تو الٹا اسے ہی بدنام کرنے لگی۔ تنگ آمد بجنگ آمد۔۔۔۔ شوہر پابندیاں لگادیں۔ اس نے پرواہ نہ کی۔ تنگ آکر شوہر نے طلاق دے دی۔ اب پولس انسپکٹر باپ کے پاس رہ کر گلچھرے اڑاتی تھی۔ یہ بڑے میاں پشتینی رئیس اور کئی تعلیمی اداروں کے سربراہ تھے۔ سیاست کے میدان میں بھی کافی رسوخ رکھتے تھے۔ سیکڑوں لوگ انہیں گھیرے رہتے تھے۔ یہ عورت بھی کسی کام سے گئی اور پھر انہیں پھانس کر مستقلاً انہیں مٹھی میں کرلیا۔ اسی کو گولڈ میڈل دلانا چاہتے تھے۔

دوسرے روز بڑے میاں آئے۔ میں نے کہا "گولڈ میڈل ملنا مشکل ہے"۔ وہ گڑ گڑانے لگے۔ مجھ پر رحم کیجئے "شاید کہنا چاہتے تھے کہ بڑھاپے میں ایک تو داشتہ ملی ہے اس نے بھی چھوڑ دیا تو کہاں جاؤں گا"۔ میں نے اس کمزور پلے کا فائدہ اٹھایا۔ کہا ایک پلڑے میں داشتہ کو رکھا ہے تو دوسرے میں لڑکی کو رکھ دو۔ وہ مان گئے۔ انہیں یہیں مجھے غلط نہ سمجھو نرس! میں نے اس طرف دلچسپی لینا بہت پہلے چھوڑ دیا تھا۔ جب میں صدر شعبہ تھا تب لڑکیاں میرے آگے پیچھے گھومتی تھیں۔ جسے چاہتا ہاتھ بڑھا کر گود میں گرالیتا تھا مگر ایک بار ایسی چوٹ کھائی کہ بس۔ لڑکی کے باپ اور بھائی نے ہزاروں روپیہ لے کر جان بخشی کی۔ تب سے کان کو ہاتھ لگایا۔ ہاں تو بڑے میاں کی داشتہ گولڈ میڈل پاگئی اور اس کے ٹھیک دس روز کے بعد بڑے میاں کی جائز بیٹی دو لاکھ کا جہیز لے کر میرے گھر آگئی۔ میری بڑی بہو بن کر۔ میرے اس تھوڑے سے ہکلے بیٹے کے لیے اس سے بہتر رشتہ ملنا کیا ممکن تھا؟ بتاؤ تو بھلا؟

میرے بیٹے کی شادی میں پورا شہر آیا۔ ایک ابھرتی ہوئی افسانہ نگار تھی بس وہ نہیں آئی۔ شہر میں موجود ہوتے ہوئے بھی اس نے میرے گھر کی تقریب نظر انداز کی۔ کوئی تحفہ بھی نہیں بھیجا۔ میں نے یہ بات گانٹھ باندھ لی اور اسے سلو پوائزن دے کر

درست کرنے کا تہیہ کر لیا۔ تم چونک کیوں گئیں؟ ڈاکٹر مریض کو سلو پوائزن دے کر ختم کر دے تو اسے دنیا کی کوئی پولس پکڑ سکتی ہے نہ دنیا کی کوئی عدالت سزا دے سکتی ہے اسی طرح استاد، طالب علم کے ساتھ فریب کرے تو کون اس پر انگلی اٹھا سکتا ہے .... بولو تو بھلا ....

میں نے اس افسانہ نگار پر کچھ زیادہ ہی توجہ دینی شروع کر دی۔ اوّل تو وہ خود ہی کافی ذہین اور محنتی تھی دوئم میری توجہ پا کر دن رات کامیابی کے لیے ایک کر دیے اس نے ایم۔اے کا رزلٹ نکلا تو وہ تھرڈ ڈویژن میں پاس ہوئی۔ جانتی ہو نرس! کیا ہوا تھا؟ تمہاری بے چینی بجا ہے۔ بتاتا ہوں۔ صبر کرو۔ اب بتانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ کوئی میرا کیا بگاڑے گا؟ تب ہی کوئی کیا بگاڑ پایا تھا؟ بات یوں ہوئی کہ میں نے اسے گھر بلا کر پورا پیپر آوٹ کرا دیا تھا۔ وہ بے چاری دھوکے میں رہ گئی۔ امتحان ہال میں جو پرچہ اس کے سامنے آیا اس تمام سوال ان سوالوں سے مختلف تھے جو میں نے اسے آوٹ کرائے تھے.... مگر وہ بھی بے حد فراخ دل تھی نرس! کبھی میری کمینگی کا مجھ سے ذکر نہیں کیا.... مجھ سے شکایت نہیں کی پہلے کی طرح بچا کھچا اپنائیت سے ملتی رہی — اینڈ فار یور یوانفرمیشن نرس! اس سال جس لڑکی کو گولڈ میڈل ملا وہ اب میری منجھلی بہو ہے خیرات بانٹنے کی ابتدا اپنے گھر سے کرنی چاہیئے، یہ میں خوب جانتا ہوں۔ جانتا تھا۔

تیسری بہو کے بارے میں کیا پوچھتی ہو نرس! میرا دل جلتا ہے۔ میں نے ایک لکھ پتی گھرانے میں لڑکے کی بات چلائی تھی مگر میرے بیٹے نے جہیز میں ایمبیسڈر کار مانگ لی .... تو ٹکا سا جواب دے دیا ان لوگوں نے .... کہا، جانوروں کا ڈاکٹر ہے اور کار کی مانگ کر رہا ہے۔ انسانوں کا ڈاکٹر ہوتا تو ہوائی جہاز کی مانگ کرتا شاید...... پھر بھی بات بن جانے کی امید تھی۔ کوئی نہ کوئی اس گھر سے ایم۔اے کا امتحان دیتا تب میں پلڑا اپنی طرف جھکا لیتا: تاک میں بیٹھا تھا کہ اپنے ہی نشانے سے گھائل ہو گیا۔ کورٹ میرج کر کے میرا بیٹا بہو گھر لے آیا ہاں نرس! تم ٹھیک سمجھی۔ انٹر کاسٹ میرج تھی وہ۔ میں نے چاہا کہ لڑکی دھکے دے کر گھر سے نکال دوں۔ مگر بیٹے نے روک دیا۔ کہا ڈیڈی! اب آپ بوڑھے ہوئے اپنے ہاتھوں کی طاقت کا اندازہ کئے بغیر انسان کو کوئی کام نہ کرنا چاہیئے۔ بہتر اسی میں ہے کہ خاموش رہیں۔ شام کو مجھے مقامی ایم۔ایل۔اے کا فون ملا کہ جس لڑکی سے میرے

بیٹے نے شادی کی ہے۔ اس کا باپ اس کا خاص آدمی ہے.... عقل مند کو اشارہ کافی
میں اپنے آپ کو عقلمندوں میں شمار کرتا تھا پھر کھوٹے سکّے کو بھنانے کا آرٹ بھی جانتا
تھا.... دوسرے دن تمام مقامی اخبار میری تعریفوں سے بھرے پڑے تھے کہ کس طرح
ایک کٹر مسلمان ہوتے ہوئے بھی میں نے دوسرے مذہب کی لڑکی کو بخوشی بہو بنانا
منظور کر لیا۔

ایم۔ ایل۔ اے کی بات پر مجھے یاد آیا نرگس کہ میں نے لوگوں سے گن گن کر بدلے
لئے مگر کھانے کا سودا بہت کم کیا.... ایک بار صرف ایک بار مجھے کراری چوٹ ہوئی۔
وہ میرے دوست کا بیٹا تھا... میرے شہر میں تعلیم کی غرض سے آیا تو رہنے کھانے کی
سہولت مانگنے اپنے والد کا خط لے کر میرے پاس آیا۔ میں نے اسے آوٹ ہاؤس میں
ٹھہرا دیا۔ ہر ماہ پچیس روپئے کرایہ بھی وصول کرتا رہا۔ اب کسی کی پیشانی پر لکھا نہیں
ہوتا کہ وہ آگے جا کر کیا بنے گا؟ دس سال بعد وہی لڑکا پہلے ایم۔ ایل۔ اے اور پھر
منسٹر بن گیا۔ ان دنوں میری ڈیپارٹمنٹل انکوائری چل رہی تھی.... تھے کچھ لوگ جو میری
ہر دلعزیزی، شہرت اور خوشحالی سے حسد کرنے لگے تھے۔ ان ہی کی لگائی آگ تھی وہ...
میں اس لڑکے کی پناہ میں پہنچا۔ دربان کو اپنے نام کی چٹ دے کر کہا "صاحب سے
کہو آپ کے چچا آئے ہیں" دربان گیا، چند لمحوں ہی میں لوٹ کر آیا۔ وزیٹنگ روم میں
بیٹھے ہوئے سب لوگوں کے درمیان باآواز بلند مجھ سے دریافت کیا "منسٹر صاحب پوچھ
رہے ہیں، آپ ان کے وہی چچا ہیں جنہوں نے انہیں آوٹ ہاؤس میں رکھا تھا اور کرایہ
بھی وصول کیا تھا" وہاں بیٹھے ہوئے سب لوگ مجھے دیکھنے لگے۔ میں خاموشی سے چلا آیا
پھر اس معاملے میں رفع دفع کرانے کے لیے مجھے متعلقہ افسران کو پچیس ہزار روپئے نذر کرنے
پڑے۔ تم کیا لکھنے لگیں؟ خط لکھ رہی ہو۔ لکھو۔ مگر میری بات بھی سنتی رہو۔ نہیں۔ مجھے آرام
کرنے کو نہ کہو۔ ابھی تو مجھے بہت کچھ کہنا ہے۔ میرے اندر چھپے ہوئے شاعر سے بھی ملو۔ میں
نے کہا تھا کہ تک بندی کرتے کرتے میں اچھا خاصا شاعر بن گیا تھا۔ اپنی جیب سے منتظمین کو
رقمیں دے کر میں اپنے نام دعوت نامے جاری کرا لیتا۔ رسائل کے مدیران کو تحائف دے
کر غزلیں، نظمیں شائع کرا لیتا۔ پھر میں نے اپنے دوستوں کے ذریعے نقادوں تک رسائی
حاصل کی اور اپنی شاعری پر مضامین لکھوائے۔ جوڑ توڑ کر کے میں اکیڈمی کا ممبر بھی بن گیا۔

اپنی دو کتابوں پر میں نے گرانٹ حاصل کی اور دھڑا دھڑ میرے مجموعوں کی نکاسی ہونے لگی۔ میرے طالب علم اس نیک کام میں میری مدد کرتے۔ میری زیادہ تر کتابیں میرے طلباء ہی نے خریدیں۔ میں مالا مال ہو گیا۔ وہ دن میری زندگی کے سنہرے دن تھے۔ میری رہنمائی میں ہر برس دو تین طلباء پی۔ ایچ۔ ڈی حاصل کرنے لگے۔ ڈاکٹر شبنم کو یہ ذرا بھی پسند نہیں آیا۔ وہ کہتا، "یہ کیا! جسے دیکھو منہ اٹھائے چلا آرہا ہے اور دو سال میں پی۔ ایچ۔ ڈی لے کر واپس جا رہا ہے"۔ پھر تحقیق کے وہ گھسے پٹے موضوع۔ شاعر، شخصیت اور شاعری..... جنہیں اپنا نام تک صحیح ہجوں میں لکھنا نہیں آتا وہ بھی ڈاکٹر کہلانے کے حقدار ہوئے جا رہے ہیں۔ مجھ پر بھلا کیا اثر ہونا؟ اس کے اعتراض میں ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے اڑا دیتا..... پھر ایک میں ہی تو ڈگریاں نہیں بانٹ رہا تھا دوسری یونیورسٹیوں کے اساتذہ بھی میرے شریک تھے۔ ہم نے اپنا گروپ بنا کر پہلے ایک دوسرے پر پی۔ ایچ۔ ڈی کرائی یعنی اپنی قابلیت کا تحریری ثبوت حاصل کیا پھر دوسروں کی طرف توجہ دی ہم جس طالب علم کی رہنمائی کرنا منظور کرتے پہلے اس سے ایک ہزار روپیہ رکھا لیتے پھر رجسٹریشن کرواتے کام کی شروعات اسی طرح کرتے کہ اس کے موضوع کا میٹر کہاں کہاں دستیاب ہو سکتا ہے، کن نرخوں پر دستیاب ہو سکتا ہے؟ کتنی مدت میں اور کس طرح حاصل کیا جا سکتا ہے یہ اسے بتا دیتے، یوں کہیے کہ لقمہ چبا کر اس کے منہ میں دے دیتے۔ وہ جاتا میٹر خرید لاتا، نوک پلک سنوار کر مقررہ مدت میں مقالہ جمع کر دیتا۔ بس اسی طرح ہمارے طلباء کی تعداد میں اضافہ ہوتا جاتا..... یہی نہیں بلکہ..... آہ! یہ کیسا درد! پانی! نرس! پانی! آہ حلق چھل چھل کر رہ گیا۔ میرا دل ڈوب رہا ہے۔ میرے گھر فون کر دو نرس! میری بیوی کو بلا دو..... میرے بیٹوں کو بلاؤ۔ کہو کہ تمہارا بوڑھا شوہر، تمہارا بوڑھا باپ، پاگل خانے کی جان لیوا تنہائی سے اکتا گیا ہے۔ وہ اب یہاں رہنا نہیں چاہتا! میں کہاں ہوں نرس! کیا کہا؟ پاگل خانے میں ہوں؟ یہ پاگل خانہ ہے؟ نہیں پاگل خانہ تو وہ دنیا ہے جہاں میں ابھی تک رہ رہا تھا۔ پاگل جو کرتے ہیں اس کی اچھائی برائی کا علم انہیں نہیں ہوتا۔ بھلے برے کی پہچان سے پرے ہوتے ہیں۔ وہ مگر نرس! انہیں کیا کہو گی جو سب کچھ سمجھ کر بھی کچھ نہیں سمجھتے۔ اصل پاگل تو یہی ہوش والے ہوتے ہیں نرس! میری بیوی سے کہہ دو، میں ہوش مند ہو گیا ہوں۔ اسے..... اور میرے بیٹوں کو بھی یہاں آنے سے روک دو..... میرا دل گھبرا رہا ہے۔ مجھے یہیں رہنے دو۔ مجھے لوٹ کر اس پاگل خانے میں نہیں جانا..... نہیں جانا۔

# پاگل خانہ

وہ مسلسل سگندھا کا تعاقب
کر رہا تھا... سگندھا کبھی دائیں جاتی کبھی
بائیں، وہ اس کے سر پر پہنچنے کو بے چین تھا
کوئی دم میں وہ اس کے سر پر چلا آتا کہ سگندھا
نے بچنے کی آخری کوشش کی۔ تمام طاقت
جمع کر کے وہ دو قدم بھاگی بھی مگر ٹھوکر لگی اور
اوندھے منھ زمین پر جاگری... ادھر وہ
اس کے سر پر پہنچ کر گول گول چکر کاٹنے
لگا۔ وفور مسرت سے اس کی بھونڈی آواز
مزید کرخت ہو گئی... گدھ جیسے مگر جسامت
میں اس سے بڑے اس کریہہ شکل خوفناک
پرندے کی چیخیں سگندھا کے کانوں میں جلتی
سلاخوں جیسی ایذا پہنچانے لگیں... اس کی
قوت برداشت جواب دے گئی... وہ بلا
ارادہ چیختی چلی گئی۔

اس کے بازو والے پلنگ پر آج
بھی مانسی سوئی ہوئی ہوتی تو کب کی سگندھا کو
بیدار کر کے اس بھیانک خواب سے نجات
دلا چکی ہوتی... مگر مانسی کمرے میں موجود ہوتی
تو کیوں سگندھا رات دو بجے تک ہندی کا
سنسنا سا جاسوسی ناول پڑھتے ہوئے جبراً
اپنے کو بیدار رکھتی ــ؟ مانسی ایک دن کے
لیے اپنی لوکل گارجین کے گھر گئی ہوئی تھی، سگندھا
نے سوچا کہ رات دو بجے کے بعد سوئے گی تو
سویرے پانچ بجے نانی کی کرکری آواز کا

عذاب جھیلنے سے بچ جائے گی۔۔۔۔ نانی کی غیر موجودگی میں بھی ان کی آواز آسیب کی طرح لڑکیوں کا پیچھا کرتی تھی۔

کافی دیر تک وہ نیم خوابی کی کیفیت میں کانوں میں انگلیاں دیے بیٹھی رہی۔ جیسے جیسے خواب کی دہشت سے اسے نجات ملتی گئی وہ نانی کی مانوس کرخت آواز کے جال میں پھنس کر پھڑپھڑاتی گئی۔

نانی اپنی مردانہ، کوّے جیسی کرخت اور گدھ جیسی رونگٹے کھڑے کر دینے والی بھیانک آواز میں حسبِ معمول صبح کا راگ الاپ رہی تھیں۔ "تلسا مے لی اٹھلی کی ناہی؟ (تلسا مرڑی اٹھ گئی یا نہیں؟) شکن، پھٹا پھٹ سرو دوے بند کر! (شکن فوراً سب کی طرف کی لائٹیں بجھاؤ) تی لیلا کبو نہا پکی تین نمبر چیا سنڈاسات جاؤن بسلی آہے۔ دادا و دیات مارون نلا باہیر یا پلا سانگ (وہ لیلا کب سے تین نمبر کے سنڈاس میں جاکر بیٹھی ہے۔ دروازے پر دستک دے کر اسے جلد باہر آنے کو کہو۔)۔۔۔ تلسا حرامخور لا پلنگا ورون کھالی اوڈھی کرا۔۔۔ (تلسا حرامخور ابھی تک جاگی نہ ہو تو اسے پلنگ کے نیچے اتار کر کھڑا کر دو۔)"۔ انگارے اگلتی ہوئی نانی کی زبان اور بے ہودہ ریمارکس!!!

گھڑی نے ٹن ٹن کر چھ بجائے تو سگندھا پوری طرح جاگ گئی۔۔۔۔ اب تک وہ نیند میں تھی ورنہ نانی کی آواز کیسے سنتی؟ نانی ہوسٹل میں تھی کہاں؟ وہ تو کل ہی شام کو ہوسٹل چھوڑ دینے پر مجبور کر دی گئی تھی۔

نانی کی ڈانٹ پھٹکار کا سورج کی کرنوں کے ساتھ آغاز ہوتا تھا۔۔۔۔ ان کی گالیاں جن کے پہلے ہوتیں ان تک پہنچنے سے پہلے وہ سگندھا تک پہنچتیں — ان کی چلاہٹ کے ساتھ جاگنا سگندھا کا معمول تھا۔ بعض اوقات وہ سوچتی، حضرت عیسیٰ کے اٹھ کہنے پر مردہ جی اٹھتا تھا۔ نانی بھی اگر کسی مردے کے سرہانے کھڑی ہو کر چلا پڑے تو ایک بار تو مردہ بھی گھبرا کر کھڑا ہو جائے گا۔۔۔ کوئی اور مردہ خوف زدہ ہو کر چاہے سانس نہ لیتا مگر ہوسٹل کی کسی لڑکی کی اتفاقیہ موت پر نانی کی چلاہٹ یقیناً اسے دوبارہ زندہ ہونے پر مجبور کر دیتی۔

سگندھا کو نانی کی بہت سی باتیں پسند نہیں تھیں۔ ہوسٹل کی لڑکیوں سے ان کا بے رحمانہ سلوک، سندر نانی پر ان کو بے جا غصہ، بات اور ہر وقت تنگ کرنے کی نانی کی

عادت سے اسے خدا واسطے کا بیر تھا۔۔۔ مگر سب سے زیادہ خار کھاتی تھی ان کے طرز گفتگو سے۔ جیسی کڑوی تائی کی زبان تھی اس کی مثال ملنی مشکل تھی۔ کڑوا کریلا نیم چڑھا والی کہاوت محمد فیصد ان کی زبان پر صادق اترتی تھی۔۔۔ چبا چبا کر الفاظ کی ادائیگی طعنہ زنی اور غیر مہذب الفاظ کا استعمال ان کی گفتگو کی خصوصیات تھیں۔ تائی کی زبان کیا تھی سر پر لٹکتی تلوار تھی جو نہ جانے کب کس کے سر پر گرے اسے بد شعار اور بد چلن ٹھہرا دیتی۔ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا۔ درٹ نٹن کی مانند وہ سب لڑکیوں کے سامنے کسی ایک لڑکی کا جیبر ہرن کرنے کو ہمیشہ تیار رہتی تھیں۔ یہ ان کا محبوب مشغلہ تھا۔

تائی کی ظالمانہ طبیعت کا پہلا تجربہ ہی مسکن دھا کے لیے بے حد تکلیف دہ تھا۔ اُسے ہوسٹل میں آئے چند دن ہوئے تھے۔ اس روز حسب معمول تائی کا نزلہ تلسا پر گرا تھا نتیجتاً اسے رات کے کھانے سے محروم کر دیا گیا تھا۔۔۔ دو دن سے بخار میں مبتلا تھی تلسا۔ کھایا پیا پہلے ہی پیٹ سے نکل گیا تھا۔ ایسے وقت علاج معالجے کی سہولت ملنی کجا رات کا کھانا بطور سزا روک دیا گیا۔

مانسی ادھر لڑکیوں کے ہال کی طرف گئی تھی وہی یہ خبر لے کر آئی تھی۔ سگندھا اس وقت نکڑ پر دھوبی کے پاس پریس کے لیے دیے گئے کپڑے لینے جا رہی تھی۔ مانسی نے بھی کہتی تو وہ تلسا کے کھانے کے لیے کچھ نہ کچھ لے آتی۔۔۔ وہ نہ جا رہی ہوتی تو مانسی کو چوک تک جانا پڑتا کیونکہ روک ٹوک اور بے جا مداخلت سے سنندا دیدی کے ساتھ ساتھ مانسی بھی کسی حد تک آزاد تھی۔ سنندا دیدی کو خود بخود یہ آزادی مل گئی تھی جب کہ مانسی نے لڑ جھگڑ کر مراعات حاصل کی تھیں۔

سنندا دیدی تائی کی چہیتی تھیں اور جو ہوسٹل کی وارڈن کی آنکھ کا تارا ہوتا ہے۔ اسے سات خون معاف ہوتے ہیں۔۔۔ دیدی پر تائی کی تائی پر بے پناہ عنایات تھیں۔ وہ کوئی شوخ، کنواری دوشیزہ نہ تھیں کہ ان کی کڑی نگرانی کی ضرورت پیش آتی وہ ایک پینتیس سالہ بیوہ تھیں جو اپنی ایم۔ اے کی نامکمل پڑھائی کی تکمیل کے لیے ہوسٹل آئی تھیں۔

سنندا تائی کے ایک دور کے رشتے کے بھائی جس تعلیمی ادارے کے سربراہ تھے وہ ادارہ لڑکیوں کے اسکول کی جماعتوں کو بڑھا کر ادارے کو کالج میں تبدیل کر رہا تھا۔

انہوں نے سنند ادیدی سے وعدہ کیا تھا کہ اگر وہ ایم ۔اے کی ڈگری حاصل کر لیتی ہیں تو انہیں بحیثیت لیکچرار کالج میں مقرر کیا جا سکتا ہے۔

نو برسوں سے بیوگی کی زندگی گذارنے والی سنند ادیدی کو ہوسٹل کا آزاد ماحول ملا اور نائی کی نظر کرم ان پر ہوئی تو کھل کھیلنے لگیں وہ۔ رنگین بھڑکیلی پوشاکیں پہننے اور بیوٹی پالر سے بھنویں ترشوانے کے بعد ان کی شوخی دیکھتے ہی بنتی۔ نائی پر تو جیسے موہنی منتر چلا دیا ہو۔ اٹھتے بیٹھتے نائی ان کی تعریفوں کے پل باندھتیں۔ ان کے نام کا جاپ کرتیں

مانسی کی بات کچھ الگ تھی۔ نائی اس سے اور لڑکیوں کی طرح ہی نفرت کرتیں مگر نفرت کے اظہار میں احتیاط کرتیں۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ مانسی نے شہر کے ایم۔ایل۔اے کے توسط سے ہوسٹل میں داخلہ لیا تھا۔ پھر وہ عام ہندوستانی لڑکی جیسی ڈرپوک لڑکی نہ تھی۔ بنگال کی لڑکیوں کی فطری بے باکی اس میں تھی۔۔۔۔ نائی نے الٹی سیدھی بات کی کہ مانسی نے منھ توڑ جواب دیا۔ نائی اسے چھیڑنا، بھڑ کے چھتے میں ہاتھ ڈالنے کی مترادف سمجھتی تھیں عموماً نائی ہوسٹل کی دوسری لڑکیوں کو مری، کتیا، بدذات اور حرامخور الفاظ سے تخاطب کرتیں۔ مانسی تہیہ کئے بیٹھی تھی کہ نائی کبھی خلاف تہذیب الفاظ سے اسے پکاریں اور وہ نائی کو نانی یاد دلائے مگر نائی کم ہوشیار نہ تھیں۔ بیلوں کو ہانکنے اور گھوڑا گاڑی میں جتنے گھوڑوں کو ہانکنے کے فرق کو سمجھتی تھیں۔

دھوبی کے یہاں سے کپڑے لے کر لوٹتی ہوئی سگندھا بریڈ کا پیکٹ لیتی آئی تھی۔ اس نے اور مانسی نے تلسا کو اپنے کمرے میں بلا کر بریڈ اور جام کھانے کو دیا تھا۔ تلسا نے پہلے تو کھانے سے انکار کیا تھا پھر ان دونوں کے اصرار پر بریڈ کھاتی اور روتی جاتی تھی۔

پسماندہ طبقے کی لڑکیوں کے لیے سرکار کا گرانٹ شدہ ہوسٹل تھا یہ۔ جہاں ظلم، بے انصافی، تفریق اور بدعنوانیوں کی فصل کاٹی جاتی تھی۔ عمارت اور اوپری سجاوٹ اور خوبصورتی سے قیاس لیا جائے تو شہر میں یونیورسٹی ہاسٹل کے بعد یہی سب سے بہتر ہوسٹل تھا مگر اندر کا حال تو ہوسٹل میں رہنے والی لڑکیاں ہی جانتی تھیں ایک عجیب دہشت بھری اور خوف زدہ زندگی تھی ان کی۔

پسماندہ طبقے کی لڑکیوں کے علاوہ، جن کے خرچ کی ذمہ داری حکومت پر تھی یہاں وہ

لڑکیاں بھی رہتی تھیں جنہیں دوسرے ہوسٹل میں جگہ نہ ملنے کے سبب مجبوراً یہاں آنا پڑا تھا یہ لڑکیاں ماہانہ خرچ خود برداشت کرتی تھیں۔ مانسی اور سگندھا سمیت کل سترہ ایسی لڑکیاں تھیں۔۔۔۔ دو لڑکیوں کو ایک کمرہ رہنے کے لیے دیا جاتا تھا۔ پسماندہ طبقے کی لڑکیاں ہوں گی ساٹھ باسٹھ جو دو تین بڑے کمروں میں بمشکل گذارا کرتی تھیں۔

مانسی، چوبیس پرگنہ کے ایک ذی حیثیت خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ سکائیکولوجی میں ایم۔ اے کر رہی تھی۔ ایڈونچر پسند تھی اس لیے ادھر چلی آئی تھی۔۔۔۔ مہاراشٹر میں آئی تھی تب انگریزی بول سکتی تھی نہ ہندی۔۔۔۔ مراٹھی تو دور کی بات ہے۔ سگندھا نے قدم قدم پر اس کا ساتھ دیا تھا۔ دونوں کی دوستی گہری ہوتی چلی گئی تھی۔۔۔۔ مراٹھی بھی مانسی نے بڑی تیزی سے سیکھ لی تھی۔ ہنس کر کہتی ــــ "یہ تائی پتہ نہیں مراٹھی میں کیا کیا گالیاں بکتی ہے۔ میں یہ زبان صرف تائی کے "مدھر وچنوں" کو سمجھنے کے لیے سیکھ رہی ہوں" اور واقعی "تائی جو پہلے یہ سمجھ کر کہ مانسی مراٹھی نہیں سمجھتی تھی اسے مراٹھی میں گالیاں دیتی تھیں اب اسے کچھ نہیں کہتی تھیں۔ ان کے اس طرح چوپا بن جانے پر مانسی اور شیر ہوگئی تھی اور فرانٹے وار انگریزی میں ان کے سامنے ہی ان پر تنقید کرتی تھی۔

ابتدا میں نلما، شکن، گائیتری، نیلما وغیرہ مانسی کے گول گول بنگالی تلفظ کی نقل کرتیں اور ہنستی تھیں۔ مگر دھیرے دھیرے مانسی کے خلوص سے متاثر ہو کر اس کی گرویدہ بن گئیں۔ البتہ اونچے طبقے کی خوشحال مقامی لڑکیاں اس سے کھنچی کھنچی رہتی تھیں ــــ خیر یہ چھوٹی موٹی رنجشیں تو سہیلیوں میں چلتی ہی رہتی ہیں مگر انہیں بنیاد بنا کر کوئی زندگی کو جہنم نہیں بنا لیتا ہاں مگر وملا تائی کی ذات ایسی تھی جس کی دہشت سے ہوسٹل میں رہنے والی لڑکیوں کی زندگی جہنم نہیں تو تکلیف دہ ضرور بن گئی تھی۔

مردوں جیسی قد و قامت والی پتھر دل اور خونخوار شکل والی وملا تائی ادھیڑ عمر کی خاتون تھیں۔ وہ طلاق شدہ تھیں۔ مانسی کو پختہ یقین تھا کہ تائی کے شوہر نے انہیں نہیں، بلکہ تائی نے اپنے شوہر کو طلاق دیا ہوگا۔ تائی کے دم خم یہی کہتے تھے۔ جو بھی ہو جس نے بھی جس کو طلاق دیا ہو، بندر کی بلا طویلے کے سر گئی یعنی ادھر ان کے شوہر کے لیے تو رادی چین ہی چین لکھتا تھا ادھر ہوسٹل کی لڑکیاں ان کی بربریت کا شکار ہو رہی تھیں۔

وملا تائی کی بھنویں ہمیشہ تنی رہتیں۔۔۔۔ جو اس بات کا مظہر ہوتیں کہ کوئی بات اُن

کی مرضی کے خلاف، یا کوئی کام ان کے حکم کے بموجب نہیں ہو رہا. حالانکہ لڑکیاں وہی کرتی تھیں جو کرنے، جیسا کرنے اور جب کرنے کا تائی حکم دیتیں۔ . . . پھر بھی تائی کی پیشانی کے بل کم نہ ہوتے۔

تائی کا کمرہ ہوسٹل میں کچھ ایسے زاویے پر تھا جہاں دروازے میں کرسی ڈال کر وہ بیٹھتیں تو سب ہی کمروں کے دروازے اور کھانے، مطالعے اور تفریح کے کمرے ان کی نظر کے دائرے میں رہتے۔ . . . کون لڑکی کس وقت جا رہی ہے . . . کون کب واپس آئی ہے اس کا پورا پورا حساب رکھتے ہوئے بھی تائی کو یہ فکر کھائے جاتی کہ لڑکیاں کوئی کام ان سے چھپا کر، انہیں اندھیرے میں رکھ کر کر رہی ہیں۔ . . اور کسی کا قدم الٹا سیدھا پڑ گیا، کوئی اونچ نیچ ہو گئی تو ان کا ہوسٹل بدنام ہو جائے گا . . . . اس لیے وہ ہمیشہ لڑکیوں کے راز معلوم کرنے کی فکر میں رہتیں . . . . کیا مجال جو کوئی لڑکی اپنے کمرے میں بند ہو کر بھی تائی کے خلاف کچھ کہہ سکے . کچھ منھ چڑھی لڑکیاں ہی نہیں، در و دیوار بھی تائی کے لیے جاسوسی کرتے تھے۔ خود تائی اکثر کواڑوں سے کان لگائے کھڑی دیکھی جاتیں۔

ایک مرتبہ کھانے کے کمرے میں مانسی اپنے کالج کے لڑکوں کی کچھ بات کر رہی تھی کہ تائی نے ٹوک دیا۔ " مانسی ایسی باتیں یہاں نہ کرو "

مانسی نے تڑ سے جواب دیا۔ " میں گندی باتیں تو نہیں کر رہی ہوں " .

تائی نے فیصلہ سنا دیا۔ " کہا نا ایسی باتیں یہاں نہیں چلیں گی "

مانسی کچھ دیر خاموش رہی پھر سگندھا سے بولی " چل ہم دونوں غسل خانے میں جا کر بات کریں گے۔

لڑکیاں بے اختیار ہنسنے لگیں، چوٹ کرنے والی مانسی کی جگہ کوئی دوسری لڑکی ہوتی تو تائی اسے اچھا مزا چکھاتیں مگر مانسی سے مقابلہ تھا اس لیے لڑکیوں کو صرف گھورنے پر اکتفا کر گئیں۔ لڑکیوں کی ہنسی میں بریک لگنے کے لیے اتنا کافی تھا۔

اس واقعے کے بعد کوئی لڑکی غسل خانے یا بیت الخلاء میں زیادہ دیر لگا دیتی تو تائی کو شک ہونے لگتا کہ وہ وہاں بیٹھ کر اسے گالیاں تو نہیں دے رہی . . . یا کسی کا پریم پتر تو نہیں پڑھ رہی

سگندھا فطرتاً حساس تھی۔ ابتداً میں اپنی تنہائی میں صرف ایک ہندی اور اچار کے

دو ٹکڑے دیکھ کر اتنی مایوس نہیں ہوئی جتنی پسماندہ طبقے کی لڑکیوں کو پتلی دال کے ساتھ موٹی روٹیاں کھاتے دیکھ کر برا لگا اسے۔ اس نے ہاتھ روک کر کہا تھا۔ "تائی! یہ کیا ہے؟"

"کہاں کیا ہے؟" تائی جو کرسی پر بیٹھی سب کے لقمے گن رہی تھیں، تلسا کی تھالی پر نگاہیں جمائے تیزی سے بولیں۔

"ان کے کھانے میں سبزی نہیں ہے؟"

"نہیں ہے..... پھر؟؟؟" تائی کے چہرے کے عضلات اسی طرح تنے رہے۔

تائی کے اس سنجیدہ اور پر اطمینان طرز عمل پر سگندھا بوکھلا گئی۔ وہ کہنا چاہتی تھی کہ نہ سہی سبزی، سلاد کے نام پر پیاز کے تین ٹکڑے ہی دیے گئے ہوتے۔ یا نام لینے بھر کو اچار کا ٹکڑا ہوتا۔ یا دال کچھ گاڑھی ہوتی۔ یا روٹیاں ہی کچھ کم موٹی ہوتیں۔

تائی نے اس کے بولنے کا انتظار نہیں کیا۔ ان کی نظریں قطار میں بیٹھی کھانا کھاتی لڑکیوں کی تھالیوں پر سے ہوتی ہوتی سگندھا کے چہرے پر آکر ٹک گئیں۔ چبھتے ہوئے لفظوں میں وہ بلند آواز سے بولیں "جو کھانا انہیں یہاں مل رہا ہے وہ ان کے گھروں میں ملنے والے کھانے سے کہیں زیادہ بہتر ہے۔ ان میں سے بہتوں کو ان کے گھروں میں ایسا کھانا تو کجا..... پیٹ بھرنے کو روٹی تک نہیں ملتی.."

"لیکن تائی! سرکار ان کا خرچ دیتی ہے" سگندھا سامنے بیٹھی لڑکیوں کے ذلت سے بے رنگ پڑ گئے چہروں کو دیکھ کر بے اختیار بول اٹھی تھی۔

"سرکار جو خرچ دیتی ہے اس میں صرف ان کے کھانے کا نہیں، بلڈنگ کی مرمت صاف صفائی سب کا خرچ شامل ہوتا ہے۔....." تائی نے کہا پھر کچھ توقف کے بعد بولیں... اور دیکھو! اپنے کام سے کام رکھو۔ نیتا گیری کے دھندے یہاں نہیں چلیں گے۔ دوسرے کے معاملوں میں ٹانگ نہ اڑاؤ۔ ورنہ پریسیڈنٹ سے شکایت کر کے ہوسٹل سے نکلوا دوں گی۔"

تائی کی دھمکی پر سگندھا ششدر رہ گئی..... مگر اس وقت وہ تائی کے مزاج سے پوری طرح واقف کہاں تھی؟ واقف ہوتی تو احتجاج کرنے کی جرأت نہ کرتی پھر یہ تو ان لڑکیوں کی بات تھی جنہیں تائی بھیڑ بکریوں کی طرح ٹریٹ کرتی تھی۔ دوسری لڑکیوں کو جو ماہانہ تین سو روپیہ خرچ دیتی تھیں کون سے پکوان پروسے جاتے تھے؟ ابتدا میں

ضرور اچھا کھانا ملا مگر رفتہ رفتہ سبزی میں تیل مسالے کم ہونے لگے ۔ ۔ ۔ ۔ روز کدو اور آلو کی سبزیاں بننے لگیں تو چند لڑکیوں نے احتجاج کرنے کے لیے خود کو تیار کرنا شروع کیا ۔ ایک دو نے اچار ، چٹنی ، جام ، جیلی کمرے میں رکھنا شروع کیا مگر ہر لڑکی تو ایسی عیاشی نہیں کر سکتی تھی ۔

روزی ، جمنا اور وینا کی ایک دن قوت برداشت جواب دے گئی ۔ ۔ ۔ ۔ وہ تین گھنٹے کا پریکٹیکل دے کر بھوک سے بے حال ہوسٹل میں لوٹی تھیں ۔ تھالی میں نام لینے بھر کے تیل مسالے والی کدو کی سبزی دیکھی تو جان جل گئی ۔ ۔ ۔ انہوں نے تھالیاں لے جاکر موری میں پٹک دیں ۔ کمرے میں جاکر پرس لیا اور سامنے والے ہوٹل میں کھانا کھانے چل دیں ۔ ہوسٹل میں واپس آتے ہی رسوئی گھر میں تائی کے سامنے طلبی ہو گئی ۔

"تم لوگوں نے کھانا کیوں نہیں کھایا ؟ " تائی نے تجاہل عارفانہ ڈھنگ سے پوچھا ۔ جیسے رسوئی بنانے والی موسی نے چغلی کرتے وقت وجہ بتائی ہی نہ ہو ۔

تینوں میں سے کسی نے جواب نہ دیا تو تائی نے موسی سے کہا ، " بھنڈرا بائی ! تینوں تھالیاں اٹھا کر لاؤ "

موسی تھالیاں اٹھا لائیں تو تائی نے انہیں حکم دیا ، اس سبزی کا " تھالی پیٹ " ( بچی ہوئی سبزی کو آٹے میں گوندھ بنایا جانے والا مہاراشٹر بن پراٹھا ) بنا کر مجھے دو ۔ میں کھاؤں گی ۔ ۔ ۔

" لیکن تائی ، یہ سبزی جوٹھی ہے " موسی نے ہچکچاتے ہوئے کہا ۔

" ہونے دو ۔ " تائی پر سکون آواز میں بولیں " لوگوں کو کھانے کو نہیں ملتا اور یہ مہارانیاں اناج کی بربادی کر رہی ہیں ۔ ۔ اناج کو ٹھکرا رہی ہیں "

جمنا تو اس غیر متوقع صورت حال سے گھبرا کر رونے لگی تھی ۔ ۔ وینا ذلت کے احساس تو روزی غصے سے کانپ رہی تھی ۔ ۔ ۔ ۔ مگر تائی کو روکنے ، تائی سے کچھ کہنے کی ہمت کسی کی نہیں ہو رہی تھی ۔ روزی شاید پھٹ پڑتی مگر وینا رہ رہ کر اس کا ہاتھ دبا کر اسے روک دیتی تھی ۔

تائی نے ان کو سامنے کھڑا کر کے " تھالی پیٹ " کھایا تھا ۔ جمنا جذباتی لڑکی تھی رو رو کر تائی سے التجا کر رہی تھی ۔ مستقبل میں اناج کی بے قدری نہ کرنے کی قسمیں کھائی

تھیں مگر اس کے رونے اور موہی کے روکنے کے باوجود نانی نے وہی کیا جو انہیں کرنا تھا۔ روزی تو آخر کار پیر پٹکتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی تھی مگر دینا اور جمنا آخر تک نانی کی "تقریب طعام" کی خاموش تماشائی بنی کھڑی رہی تھیں۔۔۔ اس روز کے بعد لڑکیاں نانی کے غصے ہی سے نہیں، ان کی خاموشی سے بھی خوف کھانے لگی تھیں۔

روزی نے اس کے بعد کئی مرتبہ کہا کہ کھانوں کے دو چار نمونے لے جاکر متعلقہ حکام کو پیش کرے مگر حالات کے بدتر ین رخ اختیار کر جانے کے اندیشے سے لڑکیوں نے اسے ایسا قدم اٹھانے سے باز رکھا۔

نانی کی عادت تھی کہ کسی کو ٹارگٹ بنا لیتیں پھر اس کا جینا حرام کر دیتیں۔ سگندھا روزی۔۔۔ جمنا، دینا ان کی بلیک لسٹ پر تھیں مگر تلسا کے واقعے نے نانی کی تمام بدترین خصلتوں اور کمینگیوں کو اجاگر کر دیا تھا۔ اقتدار حاصل ہونے پر کسی کا کس حد تک استحصال کر سکتا ہے اس کی جھلک نانی کے سلوک میں دیکھی جا سکتی تھی۔

تلسا کی غلطی کیا تھی؟ یہی نا کہ اس نے بیت الخلا کی صفائی کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ ہوسٹل کے رجسٹر میں جمعدار، صفائی کرنے والی ملازمہ وغیرہ کا اندراج تھا۔ ان کی تنخواہوں کی باقاعدگی ادائیگی ہوتی تھی جب کہ یہ تمام کام لڑکیوں کو کرنے پڑتے تھے۔ اور تنخواہ نانی کے پرس میں جاتی تھی۔

روزانہ سویرے گالیوں کی لوری دے کر نانی جو لڑکیوں کو جگایا کرتی وہ اسی لیے تو؟ ۔۔۔ پانچ چھ بجے تک صفائی مہم چلتی۔ کچھ لڑکیاں آنگن جھاڑتیں اور گوبر سے اسے لیپتیں۔ کچھ نالیوں کو صاف کرتیں تو کچھ پاخانوں کی صفائی کرتیں۔ سب کو فرداً فرداً یہ کام کرنے پڑتے تھے۔۔۔ تلسا نے جمعدار کا کام کرنے سے انکار کیا۔ کیا نانی کی دشمنی مول لے لی۔۔۔ نانی نے لاتوں گھونسوں سے اس کی پٹائی کر کے اس کی عقل ٹھکانے پر لانے کا دعویٰ کیا۔ جبراً اس سے آٹھ روز تک پاخانوں کی صفائی کرائی۔۔۔ اور مستقبل میں حکم عدولی کی صورت میں نالی میں منھ رگڑ دینے کی سزا دینے کا ارادہ بھی ظاہر کر دیا تھا۔

آٹھ روز تک سزا بھگتنے کے بعد تلسا کے غصے کا جوالا مکھی پک کر تیار ہو گیا ہے۔ ماروں گی۔۔۔ ایک دن چھوٹے پکڑ کر نانی کو ماروں گی، "وہ ہر کسی سے کہتی۔ سگندھا

نے اسے اپنی پناہ میں نہ لیا ہوتا تو تلسا یقیناً ہی کچھ ایسا کر بیٹھتی۔ روزی اور مانسی نے ابتدا میں تلسا کو بغاوت کرنے پر اکسایا تھا مگر سگندھا نے انہیں آڑے ہاتھوں لیا۔ پھر تلسا کو بھی سمجھایا تھا ــ "تم کوئی غلط قدم اٹھاؤگی تو تائی تمہاری رپورٹ کر دیں گی تمہیں ہوسٹل سے نکال دیا جائے گا۔ تعلیم ادھوری چھوڑ کر تمہیں اپنے گھر لوٹنا ہوگا۔ پھر... کیا تمہارا مستقبل تاریک نہ ہو جائے گا؟ تم پولس میں بھرتی ہونا چاہتی ہو، تمہارے اپنے پاؤں کھڑے ہونے کے سپنے کا کیا ہوگا؟ ان پڑھ کسان، مزدور یا رکشہ والے کی گرہستی بسانے بیٹھ جاؤگی یا اپنے سپنے کو پورا کرنے کی سمت میں کام کروگی؟ بولو......" مانسی نے کہا تھا "سگندھا، تم تلسا کو خاموشی سے ظلم سہہ لینے کی صلاح دے رہی ہو... کیا یہ مناسب ہے؟"

سگندھا نے کہا "میں ایسا کچھ نہیں کر رہی ہوں۔ میں یہ بات تلسا کے ذہن نشین کرا رہی ہوں کہ دوسروں کو جڑ سے اکھاڑنے کے لیے پہلے اپنے پاؤں زمین میں مضبوطی سے جمانا عقلمندی کا تقاضہ ہے۔ اکیلا چنا کیا بھاڑ جھونکے گا؟ ہاں ہم سب مل کر ظلم کے خلاف آواز اٹھائیں تو اس ظلم کا خاتمہ ہو سکتا ہے۔ کسی ایک کو قربانی کا بکرا بنانے سے کوئی فائدہ نہیں... خصوصاً تلسا کو قربانی کا بکرا میں نہیں بننے دوں گی۔ ہم تم میں سے کوئی آگے آنے کو تیار ہو تو بات الگ ہے۔ بالفرض ہمیں اس ہوسٹل سے نکالا گیا تو ہم کرایے پر کمرہ لے کر رہ لے گی مگر تلسا کو ہوسٹل سے نکالا گیا تو اس کی تعلیم نامکمل رہ جائے گی۔ لیکن سگندھا... مانسی نے کچھ کچھ قائل ہوتے ہوئے کہا تھا یہ نالی میں منھ رگڑ دینے کی سزا کیا انسانیت سوز نہیں ہے۔

"ہے ضرور ہے.... مگر مانسی.... سگندھا نے طویل سانس لے کر کہا تھا ہمارے یہاں کے ہوسٹلوں میں اس طرح کے غیر انسانی سلوک کی کئی مثالیں مل جائیں گی۔ وارڈن کی حکم عدولی کی سزا نالی میں منھ رگڑ کر بھی دی جا سکتی ہے اور جبراً گوبر کھلا کر بھی دی جا سکتی ہے اعلیٰ حکام تک شکایت پہنچے گی.... چند دنوں تک ہلچل مچے گی.... اخبارات نشہ سرخیاں لگائیں گے، فلاحی ادارے سرگرم ہو جائیں گے.... بہت ہوا تو پارلیمنٹ میں سوال اٹھے گا مگر نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات ہوگا.... یعنی نالی میں منھ رگڑے جانے والی کو گوبر کھانے پر مجبور کیے جانے والی کو صرف زبانی ہمدردی ملے گی.. اس کے دل میں پکتے ذلت اور مجبوری کے ناسور کوئی نہیں دیکھے گا۔"

تلسا پر نانی کے غیظ و غضب میں جس قدر اضافہ ہو رہا تھا تلسا اسی تناسب میں جابر ہوتی جا رہی تھی۔ سگندھا کے شفقت آمیز رویے کا خیال نہ ہوتا تو یہ نادان لڑکی اپنے مستقبل پر سوالیہ نشان لگا چکی ہوتی۔۔۔۔ سگندھا روزانہ کوئی نہ کوئی موقع نکال کر اسے سمجھاتی۔۔۔
"تلسا: بارہ سال بعد تو گھورے کے دن بھی پھرتے ہیں۔ تجھے ضرور موقع ملے گا اور تو نانی سے اپنی ذلت کا بدلہ لے سکے گی۔ تب میں تجھے نہیں روکوں گی۔۔۔۔ تو پائی پائی کا حساب کر لینا۔۔ مگر دیکھ کوئی نادانی نہ کر بیٹھنا۔۔"

سگندھا یوں ہی اسے بہلائے رکھنے کو ایسا کہتی تھی مگر حقیقتاً جب تلسا کے ہاتھ نانی کی کوئی کمزوری آئی تو وہ دوڑتی ہوئی سب سے پہلے سگندھا ہی کے پاس پہنچی تھی۔ "وہ بڈھی نانی ہم لڑکیوں پر شک کرتی ہے۔ الٹے سیدھے الزامات لگاتی ہے۔۔۔ لیکن وہ خود ننگی ہے۔ میں نے اسے ننگا دیکھا ہے۔۔۔۔ اب میں ٹکٹ لگا کر سب لڑکیوں کو ننگی نانی دکھاؤں گی۔۔"

"تلسا!" سگندھا نے اسے ڈانٹ بتائی تھی "تہذیب کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دو نانی سن لیں گی تو تمہارا وہی حشر کریں گی جو تم ان کا کرنا چاہتی ہو۔" تلسا نے تلخی سے ہنس کر کہا تھا۔ "ہونہہ! لد گئے وہ دن! نانی سارے پتے چل چکی ہے۔ اب بازی میرے ہاتھ ہے۔۔۔۔ ایسی چال چلوں گی جس میں نانی کی مات یقینی ہے۔۔۔ میرا منہ پانی میں رگڑنے والی تھی وہ۔۔۔۔"

تلسا ہنستے ہنستے رونے لگی تھی۔ سگندھا اور مانسی دونوں اس کی دماغی حالت پر ڈر رہی تھیں۔ اس کے دل میں یقیناً کوئی خوف ناک منصوبہ جنم لے رہا تھا۔ سگندھا نے اسے بہلا کر اس سے پوچھنا چاہا تھا مگر وہ یہی کہتی رہی تھی "۔۔۔ نہیں بول کر نہیں بتاؤں گی۔۔۔ دکھاؤں گی۔۔۔ تم دونوں کو سب سے پہلے دکھاؤں گی۔۔۔۔"

دوسرے ہی روز دوپہر میں وہ سگندھا اور مانسی کو چپ چاپ اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کرتی ہوئی ہال میں لے گئی۔ اس ہال میں ہائی اسکول کی لڑکیاں رہتی تھیں۔ اسی ہال سے متصل نانی کا کمرہ تھا۔ تلسا نے نانی کے کمرے میں اور ہال کے درمیانی دروازے کے قریب جا کر انہیں رکنے کا اشارہ کیا۔۔۔ ہال خالی پڑا تھا دروازے پر دیوی دیوتاؤں کے کیلنڈر اور فلمی اداکاروں کی تصاویر لگی ہوئی تھیں۔ ایک کیلنڈر کو ہٹا کر تلسا نے سوراخ

میں سے دوسری طرف جھانکا پھر سکندھا کو نزدیک آنے کا اشارہ کیا۔
سگندھا سے پہلے مانسی لپک کر پلنگ پر چڑھ گئی۔ کئی منٹوں تک دیکھتی رہی پھر خاموشی سے پیچھے اتر آئی پھر سگندھا جھجکتی ہوئی پلنگ پر چڑھی اور اندر جھانکا۔ چند لمحوں تک وہ سمجھ ہی نہیں پائی کہ جو کچھ وہ دیکھ رہی ہے اس کا کیا مطلب نکالا جا سکتا ہے پھر جیسے اس کے دماغ میں ایک دھماکہ ہوا وہ پیچھے اتر کر بھاگتی ہوئی ہال سے باہر نکل گئی۔ تلسا اور مانسی اس کے پیچھے تھیں۔ کمرے میں پہنچ کر سگندھا غٹا غٹ پانی پئے جا رہی تھی۔ مانسی کو دیکھتی ہی بولی۔۔۔ "مانسی! وہ کیا تھا؟ میں نے وہ نظارہ کیوں دیکھا۔۔۔ ہے بھگوان۔
وہ بدحواس تھی۔۔۔ پھر بھی اسے اتنا خیال ضرور تھا کہ تلسا کی بہ نسبت مانسی اس کے سوال کا جواب بہتر طریقے سے دے سکے گی۔
مانسی نے غور سے اسے دیکھتے ہوئے کہا "میں دس برس کی تھی تب سے ہوسٹلوں میں رہ رہی ہوں۔ میرے لیے ایسی باتیں اب اسرار نہیں رہیں۔۔۔ مگر تم سگندھا! تم کیا اس رموز سے اب تک انجان ہو؟ تلسا تم سے عمر میں کتنی چھوٹی ہے۔۔۔ مگر وہ تو ہراساں نہیں ہوئی وہ منظر دیکھ کر۔۔۔"
"تلسا نے قطع کلام کرتے ہوئے نظریں جھکا کر کہا۔۔۔ "دیدی! میں نے تائی کے کمرے میں یہ سب دیکھنے کی غرض سے جھانکنا نہیں شروع کیا تھا۔ دوپہر کو لڑکیوں کے جانے کے بعد میں نے خاموشی سے تائی کے کمرے کے دروازے کی درز کو جو میں نے چوڑا کیا تو اس لیے کہ میں وہاں سے جلتی ہوئی تیلی اندر پھینکنا چاہتی تھی۔ میں تائی سے بدلہ لینا چاہتی تھی اچانک ایک دن میں نے تائی کو ننگا ہوتے دیکھا پہلے تو میں کچھ سمجھی نہیں مگر وقت سب سمجھا دیتا ہے۔ اب آگ سے بھی زیادہ خطرناک ہتھیار میرے ہاتھ آگیا ہے۔ ایک روز ٹکٹ لگا کر یہ تماشہ میں سب لڑکیوں کو دکھاؤں گی تب ہی میرے کلیجے میں ٹھنڈک پڑے گی۔"
"نہیں تلسا نہیں۔ میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔" سگندھا ہذیانی انداز میں بولی تھی۔ "ایسا ہرگز نہ کرنا۔ کچی عمر کی لڑکیوں پر غلط اثر پڑے گا۔" ایسا نہ کرنا، تلسا ہرگز نہ کرنا۔"
"تلسا خوفناک ڈھنگ سے ہنس کر بولی تھی "کیوں نہ کروں ایسا؟ تائی سے بدلہ لینے کا

ایک موقع ہاتھ آیا ہے اسے نہ جانے دوں گی۔ میں اپنی توہین آج تک نہیں بھلا پائی ہیں جب بھی آئینہ دیکھتی ہوں تو مجھے اپنا منھ میں گندگی میں لتھڑا نظر آتا ہے۔ تائی جب مجھے دیکھتی تو مجھے محسوس ہوتا ہے اس کی آنکھوں میں تمسخر ہے، تضحیک ہے۔۔۔ میں اپنے کو گندا سور سمجھنے لگی ہوں۔۔۔ فرق اس میں اور مجھ میں یہ ہے کہ سور کو اپنی توہین اپنی ذلت کا احساس نہیں اس لیے وہ غیر مطمئن بھی نہیں۔۔۔ مگر اپنی ذلت کے احساس کی آنچ نے مجھ سے میرا وجود چھین لیا ہے۔ میں اب تلسا نہیں رہ گئی ہوں۔ میں مجسم انتقام بن چکی ہوں۔ یہ آگ وہی آگ ہے جو شریف کو بدمعاش بناتی۔ میں کمزور ہوں اس لیے تائی کا منھ نالی میں نہیں رگڑ کر سکتی لیکن اس کے وجود کی گندگی سے سب کو واقف تو کرا سکتی ہوں۔۔۔ مجھے یہ قدم سے اٹھانے سے کوئی نہیں روک سکتا یہ آخری پتہ ہے میرا۔۔۔ اپنے احساس کی آنچ کو تائی کی رسوائی کی ٹھنڈی پھوار سے شانت کروں گی میں۔ گندی تائی۔۔۔ ننگی تائی۔۔۔ کو دیکھنے میں کیسا لطف آئے گا سب کو۔۔۔" اس پر [illegible] طاری ہو گئی تھی۔

"تلسا!" سگندھا نے اسے ایک طمانچہ رسید کر دیا تھا اور تلسا ہکی بکی رہ گئی تھی۔ مانسی بھی سگندھا کے اشتعال کو سمجھنے سے قاصر تھی۔ یکایک تلسا پھوٹ پڑی۔۔۔۔ "تم نے مجھے مار دیا دی!"

"ہاں! بدلے میں چاہے تم مجھے چار تھپڑ لگا لو میں تمہیں یہ انتہائی قدم نہ اٹھانے دوں گی تم اپنی تسکین کے لیے اتنی ساری لڑکیوں کی معصومیت کو بھینٹ چڑھانا چاہتی ہو میں ابھی جا کر تائی کو خبردار کر دیتی ہوں۔۔۔"

مانسی نے دونوں کو شانت کیا تھا۔ تلسا کو دوسری لڑکیوں تک تو سگندھا کو تائی تک جانے سے روکا تھا۔۔۔ اور تلسا نے سگندھا کا پاؤں چھو کر معافی مانگ لی تھی۔ بظاہر تلسا نے ان دونوں کا مشورہ مان لیا تھا۔

دوسرے دن اتوار تھا۔ دوپہر کو لڑکیاں دھما چوکڑی مچا رہی تھیں جب متعلقہ حکام پچھلے دروازے سے ہوسٹل میں داخل ہوئے۔ تلسا ان کی راہنمائی کر رہی تھی۔ واقعی اس نے بہت سوچ سمجھ کر آخری پتہ متعلقہ حکام کے سامنے اوپن کیا تھا۔ اس ترپ چال کے بعد تائی کے پاؤں اکھڑ جانا یقینی تھا اور اکھڑے بھی۔ پلنگ پر اعلیٰ حکام پلنگ پر چڑھ کر دیکھے بعد دیگرے تائی کے کمرے میں جھانک رہے تھے جہاں تائی اور کستند دیدی بالکل عریاں حالت میں اژدہوں کی مانند ایک دوسرے میں گڈمڈ ہوئی پڑی تھیں۔
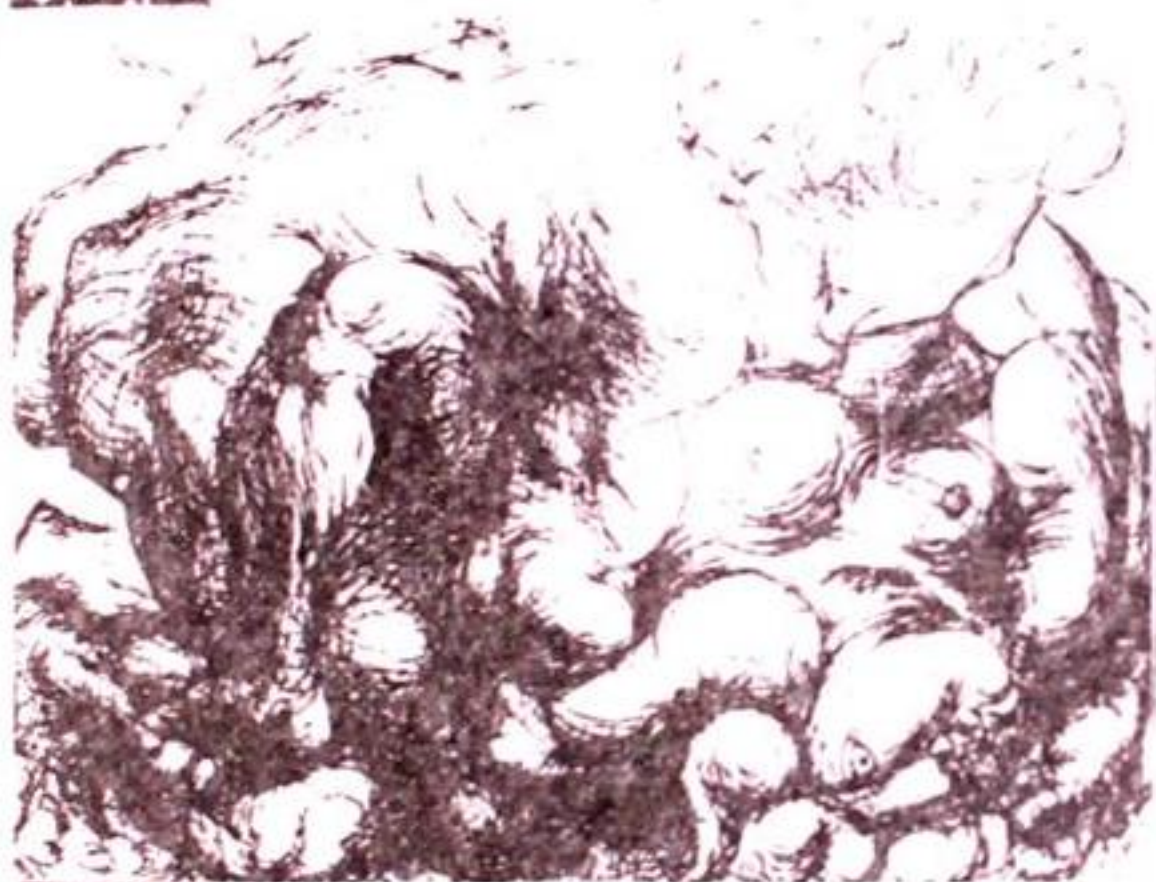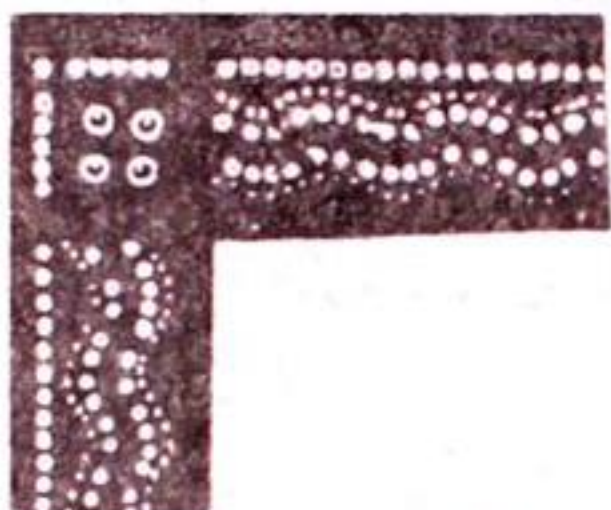
احساس کی آنچ

ابھی ابھی ڈاکیہ سوربھ کا خط کرشنا کے ہاتھوں میں دے گیا ہے۔ ہمیشہ کی طرح فوراً خط کھول لینے کی عادت پر جبراً لگام لگاکر کرشنا پرانی یادوں کو تازہ کرنے میں منہمک ہوگئی ہے وہ جانتی ہے سوربھ اب کبھی اس گھر میں نہیں آئے گا وہ جان گیا ہے وہ سمجھ گیا ہے کہ کرشنا بزدل ہے۔ اور بزدل سے پناہ مانگنا یا مدد کی امید کرنا نادانی ہے۔

اس روز کرشنا نے ڈاک دیکھنے کے لیے دروازہ تھوڑا سا کھولا تھا کہ اس پر نظر پڑ گئی تھی۔ وہ تخت پر بیٹھا بیٹھا لڑھک گیا لگتا تھا۔ یقیناً اس نے بہت دیر تک سُن گن لینے کی کوشش کی ہوگی کہ کرشنا اندر کیا کر رہی ہے سوگئی ہے یا جاگ رہی ہے؟ پھر نیند سے ہار کر وہ جوتوں سمیت تخت پر پسر گیا ہوگا۔

کرشنا دروازہ کھول کر باہر نکل آئی تھی جون کی گرم دوپہر تھی۔ لو چل رہی تھی۔ وہ پسینے میں تربتر ہو رہا تھا۔ کرشنا نے آگے بڑھ کر اسے پکارنا چاہا تھا مگر کچھ سوچ کر رک گئی تھی۔ اس قدر گہری نیند اسے کرشنا کے گھر ہی میں آتی تھی ورنہ اس کے گھر میں سکون کہاں تھا؟ اسی لیے تو گرم لو کے جن تھپیڑوں میں انسان کو بیٹھنا برداشت نہ ہوتا۔ وہ مزے سے سو رہا ہوا تھا۔

برآمدے کے دائیں کونے سے اتر کر،

دھوپ اس کے چہرے پر پڑنے ہی کو تھی۔ کرشنا نے آگے بڑھ کر پام کے دو بڑے گملوں کو ایک دوسرے کے نزدیک کر دیا۔ سایہ اس کے وجود پر پھیل گیا۔ کرشنا کو پھر بھی تسلی نہیں ہوئی۔ ڈرائنگ روم میں لوٹ کر اس نے چھوٹا ٹیبل فین اٹھایا۔ اسے پنکھا اٹھاتے دیکھ کر موہنیش نے برآمدے میں جھانکا۔ تخت پر اسے سویا دیکھ بُرا سا منھ بنا کر کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ کرشنا نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ مگر موہنیش چپ نہ رہ سکا... یوں ہی تو پڑا ”خوب خدمت ہو رہی ہے اس چرسی مار کی“۔

کرشنا نے تنبیہی نظروں سے اسے دیکھا اور کہا ”چپ ہو جاؤ۔ واپس آکر تم سے بات کرتی ہوں۔“

چھوٹی میز پر پنکھا رکھ کر کرشنا نے اسے آن کر دیا۔ پھر لوٹ کر ڈرائنگ روم میں آئی اور موہنیش کے سامنے کھڑی ہو کر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا ”اب کہو، کیا کہہ رہے تھے۔“

موہنیش لمحہ بھر کے لیے سپٹا گیا۔

کرشنا نے سرد لہجے میں کہا جو کہنا چاہتے ہو بے جھجک کہہ ڈالو۔ لیکن بات شروع کرنے سے پہلے یہ نہ بھولنا کہ اس کا نام سورَبھ ہے۔ اسے اسی نام سے پکارنا ہے تمہیں۔“

جلتی پر جیسے تیل پڑا۔ موہنیش نے بھبک کر کہا ”وہ کون لگتا ہے آپ کا؟ کیوں محبت کی برسات کیے جاتی ہیں اس پر؟“

”تمہارے حصے کی محبت تو نہیں دے رہی ہوں۔ اس کے آنے کے بعد سے تم نے اپنے تئیں میری ممتا میں کوئی کمی محسوس کی ہے؟“ کرشنا نے پرسکون آواز میں کہا۔

”نہیں“ وہ انکار نہیں کر سکا۔ ”مگر کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ وہ آپ کا کوئی نہیں ہے۔ اس کا اور آپ کا کوئی رشتہ نہیں ہے“

”کیسے نہیں ہے؟“ کرشنا نے اسی خود اعتمادی سے کہا۔

”میں آپ کا بیٹا ہوں۔“ موہنیش نے بھی خود اعتمادی کا مظاہرہ کیا ”میرا اس کا کیا مقابلہ؟“

”وہ بھی میرا بیٹا ہے مجھے ماں کہتا ہے۔“

”ماں پکارنے سے ہی کوئی ماں نہیں ہو جاتی۔ بیٹا کہہ دینے سے کوئی بیٹا نہیں ہو جاتا

آپ سچ مچ تو اس کی ماں نہیں ہے ویسے ایک بیٹے کے ہوتے ہوئے آپ کو کسی اور کو بیٹا ماننے کی کیا ضرورت ہے؟"

موہنیش کا لہجہ جارحانہ ہو گیا تھا۔ کرشنا نے پھر بھی ضبط سے کام لیا۔ بولی "بجھے بیٹے کی نہیں، لیکن سوربھ کو ماں کی ضرورت ہے۔ اپنی کوکھ میں بچے کو نو ماہ تک رکھنے والی اپنے خون سے اسے سینچ کر بے پناہ تکلیف کو برداشت کر کے اسے جنم دینے والی عورت ہی ماں نہیں ہوتی۔ ماں وہ بھی ہوتی ہے جو کسی کے درد کو پہچان کر اس کے دکھ کو اپنا دکھ سمجھ کر، اسے اپنی گود میں چھپا کر تسلی دیتی ہے۔ محبت کے لیے ترسے ہوؤں کو ممتا دیتی ہے ماں کی ممتا کو محدود دائروں میں قید نہ کرو موہنیش! ماں کی ممتا بہتی ندی کے شفاف اور پاک پانی جیسی ہوتی ہے جو ان سب کو سیراب کرتی ہے جو پیاس بجھانے کی غرض سے اس کے پاس آتے ہیں۔"

"لیکن ممی!" موہنیش اچنبھا بولا "اس کا خیال تو کیجئے وہ ایک شرابی کا بیٹا ہے"

"خود تو شرابی نہیں ہے" کرشنا نے تڑکی بہ تڑکی بولا۔

"اوہ! نانسنس!" موہنیش نے اپنے زانو پیٹ ڈالے۔ غصہ ظاہر کرنے کا یہ اس کا خاص انداز تھا۔ "میں آج ڈیڈی سے اس سلسلے میں بات کروں گا۔ مجھے یہ لڑکا بالکل پسند نہیں ہے۔"

"موہنیش! سوربھ کے بارے میں جو بات کرنا ہے مجھ سے کرو۔ شکایت تمہیں مجھ سے ہے۔ پھر ڈیڈی سے بات کیوں کرو گے؟" کرشنا نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "تم سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے؟ وہ ایک دکھی لڑکا ہے۔ تم اس کے حالات جان کر اس سے سمجھوتہ کر لو تو اچھا ہے"

موہنیش کو بے پرواہی سے کندھے اچکاتے دیکھ کر کرشنا نے پھر تنبیہہ کی "اور دیکھو موہنیش، تم میرے اکلوتے بیٹے ہو۔ میں تمہیں جان سے زیادہ عزیز رکھتی ہوں۔ میری زندگی کا حاصل تم ہو۔ میں اور تمہارے ڈیڈی تمہیں ہر ممکن عیش و آرام مہیا کراتے ہیں۔ ہم اپنا فرض نبھاتے ہیں تم اپنا فرض پہچانو۔ تم ہم سے یعنی اپنے والدین سے کسی معاملے میں جواب طلب کرنے کے حقدار نہیں ہو۔ مجھے دوبارہ یہ سب کہنے پر مجبور نہ کرنا۔ آئندہ تم مجھ سے اس طرح بدتمیزی سے بات نہیں کرو گے؟"

موہنیش کو ہکا بکا چھوڑ کر کرشنا اپنے کمرے میں آ گئی۔ بستر پر لیٹ کر کروٹیں بدلتی رہی موہنیش کا رویہ اسے دل ہی دل میں خوف زدہ کر دیتا تھا۔۔۔۔ مگر اپنی فطری رحم دلی اور ممتا کے کارن وہ سوربھ کو دُتکار بھی نہیں سکتی تھی۔

چار بجے کرشنا نے دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔ سوربھ جاگ چکا تھا اس نے ڈرائنگ روم سے آتی پاپ میوزک کی آوازوں کو سُن کر موہنیش کے گھر میں موجود ہونے کا قیاس کر لیا تھا اسی لیے دروازہ کھٹکھٹا کر اپنے جاگنے کا اشارہ نہیں دیا تھا۔ اسے یقیناً کرشنا سے کوئی خاص بات کہنی تھی اسی لیے واپس نہیں گیا تھا۔ موہنیش کا اہانت آمیز سلوک اس کے لیے ناقابل برداشت ہو جاتا تھا۔ وہ حتی الامکان اس کے سامنے آنے سے گریز کرتا تھا۔

کرشنا نے اسے ڈرائنگ روم میں بلا لیا۔ پھر کچن میں پانی پینے گئی واپس آ کر دیکھا تو موہنیش اپنے کمرے میں جا چکا تھا۔ اس نے اطمینان کی سانس لی۔ ورنہ جس طرح وہ کرشنا پر خفا ہوا تھا یقیناً سوربھ کو بھی کچھ کہہ گزرتا۔ ظاہر ہے کرشنا یہ برداشت نہ کر پاتی۔۔۔۔ پھر بات بڑھنا یقینی تھا۔

موہنیش کی طرف سے مطمئن ہو کر اس نے سوربھ پر توجہ دی۔ اس کا لمبوترا سوکھا چہرہ ایسا لگ رہا تھا جیسے طویل بیماری جھیلنے کے بعد اٹھا ہو۔

کرشنا نے پوچھا "یہ تم بیچ بیچ میں کہاں غائب ہو جاتے ہو؟ کیا حال ہے تمہارے گھر کا؟ تمہارے پتا کے طور طریقوں میں کوئی تبدیلی آئی یا وہی چال بے ڈھنگی ہے جو پہلے تھی۔ وقت پر گھر آ جاتے ہیں یا۔۔۔۔"

کرشنا نے جان بوجھ کر جملے کو ادھورا چھوڑ دیا تھا۔ سوربھ جس عذاب میں مبتلا تھا اس سے وہ خوب واقف تھی۔ اسی لیے سوربھ پر اس کی ممتا امڈی پڑتی تھی۔ جب سے سوربھ کی ماں گذری تھی تب سے سوربھ کے پتا نے خود کو شراب میں ڈبو لیا تھا۔۔۔۔ تمام رات شراب کے اڈے پر پڑے رہتے۔ گھر لوٹنے تک کا انہیں ہوش نہ ہوتا۔ کبھی کوئی سوربھ کو اطلاع دیتا کہ تمہارے پتا فلاں سڑک پر نالی میں گرے پڑے ہیں۔ سوربھ جاتا اور انہیں اٹھا لاتا، نہلاتا، دُھلاتا، نالیوں کے کیچڑ، سڑک کی گندگی اور قئے میں لتھڑے ان کے جسم کو دھوتے ہوئے بارہا سوربھ کے دل و دماغ میں ایسی ہیک بھر جاتی کہ وہ کئی کئی دن تک

کھانا نہ کھا پاتا۔۔۔ تب وہ بار بار تنبیہ کرتا کہ آئندہ اپنے پتا کے جسم کو غلاظت سے پاک نہیں کرے گا۔۔۔ بھلا جس کا دل پاک نہیں، اس کا جسم بھی غلاظت کا ڈھیر بنا رہے تو کیا مضائقہ ہے۔۔۔ مگر وہ اپنے اس عہد پر زیادہ عرصے تک قائم نہ رہتا۔۔۔ جہاں پتا کے کہیں مدہوش پڑے ہونے کی خبر پاتا تو اپنے آپ کو روکنا اس کے لیے دشوار ہو جاتا۔ وہ وہاں پہنچ کر وہ انہیں اٹھا لاتا۔

گھر میں سوربھ کے علاوہ اس کی بوڑھی معذور دادی تھیں۔ سوربھ شروع میں ان ہی کی گود میں سر چھپا کر اپنی بدقسمتی پر رویا کرتا تھا۔ دادی اُسے صبر کی تلقین کرتیں اور خود بھی روتی جاتیں۔ بعض اوقات لگاتار رونے سے ان کی طبیعت بگڑ جاتی اور انہیں سنبھالنا مشکل ہو جاتا۔۔۔ رفتہ رفتہ سوربھ نے ان سے بھی اپنا دکھڑا کہنا بند کر دیا۔ چھوٹی سی عمر میں تجربے کی آگ نے پکا کر اسے سمجھ دار بنا دیا تھا۔

سوربھ کی ماں کرشنا کے گاؤں کی تھی وہ زندہ تھی تب گاہے بگاہے کرشنا کے پاس آیا کرتی۔ وہ نہیں رہی تو تب سوربھ کرشنا کے گھر آتا رہا۔ بن ماں کے اس بچے کے تئیں کرشنا کی محبت بڑھتی گئی۔ اب بھی جب سوربھ کا دل پھوٹ پھوٹ کر رونے کو چاہتا وہ کرشنا کی آنچل میں آ چھپتا۔ یہی دیکھ کر موہنیش سوربھ سے جلنے لگتا۔

"سوربھ! بہت دکھی لگتے ہو؟ چہرہ اُترا ہوا ہے۔ صبح سے کچھ کھایا پیا بھی ہے یا نہیں؟" کرشنا نے یادوں کے بھنور سے نکلتے ہوئے پوچھا۔ سوربھ زبان سے کچھ نہ بولا۔ سر جھکائے بیٹھا رہا۔ کرشنا کے دوبارہ پوچھنے پر اس نے سر ہلا کر نفی میں جواب دیا۔۔۔ کرشنا اس کے لیے کچن سے کچھ لانے کے لیے آگے بڑھی ہی تھی کہ سوربھ نے اس کا آنچل تھام لیا اور بلک بلک کر رونے لگا۔

کرشنا نے اسے اپنے قریب کر لیا۔ اس کا سر سہلاتی رہی۔ اسے کھل کر رو لینے دیا۔ پھر کہا "بیٹے! مجھے اپنی ماں کی جگہ سمجھتے ہو تو بتاؤ کیا ہوا؟ کیوں اتنے دکھی ہو۔" وہ سسک کر بولا "پتا جی نے کل لیلا بائی سے بیاہ کر لیا"۔

"کیا؟" کرشنا حیرت سے بولی "بیاہ کر لیا؟ اس نوکرانی سے۔"

سوربھ نے دوبارہ اثبات میں سر ہلا دیا۔

"مگر یہ کیوں کر ممکن ہوا؟ تمہاری دادی نے انہیں روکا نہیں؟" کرشنا نے پوچھا۔

"وہ ہماری سننے کب ہیں؟" سوربھ بے چارگی سے بولا۔"

"پھر بھی.... کیا تم لوگوں کو پہلے سے سن گن نہیں ملی؟"

"آپ کو میں نے پچھلی دفعہ بتایا تو تھا۔" سوربھ نے سر جھکا لیا تو کرشنا کو یاد آیا۔

کوئی تین ماہ پہلے سوربھ نے ایک روز اس سے کہا تھا "پتاجی، پرسوں کی شراب کی دوکان پر کسی سے الجھ پڑے اس نے جم کر پٹائی کر دی پتاجی کی۔"

"اوہ پھر؟" کرشنا نے افسوس ظاہر کیا۔"

"پھر کیا؟ مجھے کسی نے بتایا۔ میں گیا اور انہیں رکشہ میں لاد لیا۔"

"کیا اسپتال میں داخل ہیں۔"

"نہیں اتنی بھی خراب حالت نہیں ہے۔ لیلا بائی نے ہلدی لگا کر چوٹوں کو سینک دیا تھا تین دن سے لیلا بائی رات کو بھی ہمارے گھر رہتی ہے۔"

"کیوں؟"

"پتاجی اسے روک لیتے ہیں۔ کہتے ہیں دادی چل پھر نہیں سکتی۔ میں گہری نیند سو جاتا ہوں رات کو طبیعت خراب ہو جائے تو کوئی پانی پلانے والا تو ہونا چاہیے۔"

کرشنا خاموش رہ کر کچھ سوچنے لگی تھی۔ سوربھ نے آنکھیں نیچی کر کے رک رک کر کہا "وہ پتاجی کے کمرے میں ہی سوتی ہے۔"

سوربھ کے دل میں اپنے پتا اور لیلا بائی کے تعلقات کو لے کر شبہات تھے۔ اس کا نابالغ ذہن شاید یہ طے نہیں کر پا رہا تھا کہ ان تعلقات میں برائی کہاں ہے؟ کیوں اس کا دل کہہ رہا ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ ٹھیک نہیں ہو رہا ہے۔... دوسری طرف کرشنا تذبذب میں تھی کہ سوربھ کی بات کے جواب میں کیا کہے کیا نہ کہے۔ سوربھ کی عمر ابھی اتنی نہیں ہے کہ اسے ان باریکیوں سے واقف کرایا جائے۔ یعنی سماجی زندگی میں ناقابل قبول رشتوں کی وضاحت کی جائے... اس لیے اس نے موضوع بدل دیا تھا۔

اس کے بعد بھی ایک دو مرتبہ سوربھ نے لیلا بائی کے بڑھتے ہوئے اقتدار کی شکایت کی تھی اور کرشنا نے مصلحتاً خاموشی کو ترجیح دی تھی۔ سوربھ کی دلجوئی کرنا ایک بات تھی۔ اس کے پتا کے معاملے میں کچھ کہنا دوسری بات تھی ــــ وہ اسے مناسب نہیں سمجھتی تھی۔"

کرشنا پرانی یادوں میں کھوگئی تھی۔ یہ وقفہ شاید کچھ زیادہ ہی لمبا ہوگیا تھا۔ کرشنا کی محویت ختم کرنے کی غرض سے سوربھ زور سے کھنکارا۔ کرشنا نے چونک کر اسے دیکھا تو وہ جلدی سے بولا۔ "پرسوں لیلا بائی جھونپڑ پٹی میں رہنے والے اپنے کچھ رشتہ داروں کو لے کر آئی تھی۔ ان سب نے پتا جی کو بہت ڈرایا دھمکایا۔" "کیوں ڈرانے دھمکانے کی نوبت کیوں آئی؟" کرشنا نے پوچھا۔

"لیلا بائی کا کہنا ہے کہ وہ پتا جی کے بچے کی ماں بننے والی ہے۔ کل وہ لوگ پنڈت کو لے کر آئے اور پھیرے کرا گئے۔"

کتنی بڑی بات کہہ دی سوربھ نے اور وہ بھی کتنی آسانی سے۔ کرشنا اسے تکتی رہ گئی۔ سوربھ اور موہنیش ہم عمر ہیں۔ موہنیش اب تک اس سے لاڈ کرتا۔ اور لاڈ کرواتا ہے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کے لیے ضد کرتا ہے۔ وہ ذرا کسی پر ممتا دکھائے تو حسد کرنے لگتا ہے۔ بالکل بچّہ ہے وہ ابھی، اسے اُن باتوں کا کچھ بھی علم نہیں ہے جن کو سوربھ پوری طرح سمجھتا ہے عملی تجربہ موہنیش کا صفر ہے ادھر سوربھ ان تجربوں کا علم رکھنے کی بنا پر مستقل عذاب جھیل رہا ہے۔ سوربھ بچپن کی دہلیز لانگھ کر سیدھا بڑھاپے کی حدود میں داخل ہوگیا ہے۔ نہ بچپن کی معصوم شرارتوں کا لطف لے سکا نہ لڑکپن کی خواہشات کی تکمیل کر سکا۔

کرشنا نے اسے سمجھایا۔۔۔۔ اسے حوصلہ نہ ہارنے کی تلقین کی۔ اسے اپنی مدد کا یقین دلایا تب کہیں جاکر سوربھ کا دکھ کچھ ہلکا ہوا۔ وہ پھر آنے کا کہہ کر چلا گیا۔

پھر ایک ہفتے بعد سوربھ کی شکل دکھائی دی۔ آتے ہی بولا "دادی گذر گئی" کرشنا نے رسمی طور پر افسوس ظاہر کیا۔

"نہیں" سوربھ فلسفیانہ انداز میں بولا "افسوس کیا؟ یہ تو بہت اچھا ہوا کہ دادی گذر گئی ہم بلا وجہ موت سے ڈرتے ہیں۔ مصیبت کے ماروں، لاعلاج مریضوں اور دکھی غم زدہ انسانوں کے لیے موت سکون اور نجات کا پیغام لے کر آتی ہے۔۔۔ یہ تو بہت اچھا ہوا کہ دادی ان غموں سے نجات پاگئی۔"

کرشنا نے اس کی بے ربط باتوں سے قیاس لگایا کہ اسے دادی کا موت کا بہت صدمہ ہوا ہے۔ اسی لیے ایسی بہکی بہکی باتیں کررہا ہے۔ اس نے اسے سمجھا بجھا کر واپس بھیج دیا۔

شام کو سوربھ پھر آگیا۔ کرشنا کے پتی ابھی کورٹ سے لوٹے نہیں تھے۔ موہنیش باہر گیا ہوا تھا۔ سوربھ کرشنا کی کرسی کے پاس نیچے بیٹھ گیا۔ چند لمحے اندرونی کشمکش میں گرفتار رہا۔ پھر دبے الفاظ میں بولا "کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ آپ مجھے اپنے پاس رکھ لیں۔ میں گھر کا سب کام کر دیا کروں گا۔ دراصل میرے گھر کا ماحول میرے لیے ناقابل برداشت ہوتا جا رہا ہے۔"

"کیا؟" کرشنا کچھ بدحواس سی ہو گئی۔

"ہاں، میں چاہتا ہوں آپ مجھے اپنے پاس رکھ لیں.... میں....."

اس سے آگے سوربھ نے کیا کہا، کرشنا کو سنائی نہیں دیا۔ اس کے کانوں میں سائیں سائیں کی آوازوں کے ساتھ موہنیش کے الفاظ گونج رہے تھے۔ "آج آپ نے اسے میرے پیار میں حصہ دار بنایا ہے کل میرے حقوق آدھے اس کے نام کر دینا۔ وہ انگلی پکڑ کر پہونچا پکڑ رہا ہے۔ وہ دھیرے دھیرے آپ کے دل میں جگہ بنا رہا ہے ایک دن وہ اس گھر میں رہنے آجائے گا۔ جائداد پر حق جتائے گا۔"

کرشنا نے اپنے کان بند کر لیے.... پھر آہستہ آہستہ مگر ایک ایک لفظ پر زور دیتی ہوئی بولی۔ "سوربھ! ایسا نہیں ہو سکتا بیٹے! میرے جذبات میرے اپنے ہیں، میں چاہے جس سے لگاؤ رکھنے اور چاہے جس سے نفرت کرنے کے لیے آزاد ہوں مگر جہاں میرے جذبات میرے شوہر اور بیٹے کے مفاد سے ٹکراتے وہاں میرے لیے اپنے جذبات کو قابو میں رکھنا ضروری ہو جاتا ہے۔ میرے افعال اسی وقت تک قابل تحسین ہیں جب تک کہ وہ میری شادی شدہ زندگی کی بنیاد کو کمزور نہیں کرتے۔ میں اپنے کسی فعل سے اپنے گھر کی سکون کی قربانی نہیں دے سکتی.... دینا نہیں چاہتی۔ تمہیں اپنے گھر میں پناہ دینے کے لیے مجھے اپنے شوہر سے اجازت لینی ہوگی۔ موہنیش کا عندیہ جاننا ہوگا.... تم میرے بیٹے کے مزاج سے واقف ہو۔ تمہاری جتنی مدد میں تمہارے دور رہتے ہوئے کر سکتی ہوں اتنی مدد تمہیں گھر میں رکھ کر نہیں کر سکتی ہیں....."

کرشنا کا جملہ ختم بھی نہیں ہوا تھا کہ سوربھ نے اٹھ کر اس کے پاؤں چھوئے اور تیزی سے باہر چلا گیا۔ کرشنا پر گھڑوں پانی پڑ گیا.... سوربھ جاتے جاتے اس کی بلکہ تمام عورت ذات کی حیثیت پر سوالیہ نشان لگا گیا تھا۔

رات کے کھانے پر کرشنا نے اپنے شوہر امول سے سوربھ کا ذکر چھوڑ دیا۔ سوربھ

کے بنّاک کے بیاہ کرنے کے بعد سوربھ کی قابلِ رحم حالت کا ذکر کرتے ہوئے اس نے کہا "لیلا بائی جس طبقے سے تعلق رکھتی ہے وہاں اس سے یہ امید نہیں رکھی جاتی کہ وہ سوربھ کے بنّاک کے ساتھ گرہستی بسائے گی وہ یقیناً اُن کی جمع پونجی ہڑپ کر کے کسی اور کا ہاتھ تھام لے گی تب سوربھ کا کیا ہو گا؟ آپ وکیل ہیں سوربھ کے لیے کچھ کیجیے۔ کم از کم مکان ہی سوربھ کے نام ہو جائے تو اچھا ہے۔"

"ممی آپ پھر اس کی بات لے بیٹھیں" موہنیش چڑ کر بولا۔

کرشنا نے اسے ڈانٹ دیا، "بیچ میں مت بولو۔ میں تمہارے پتا سے بات کر رہی ہوں میں تم سے پہلے بھی کہہ چکی ہوں کہ تم مجھ سے کسی بات کا جواب طلب نہیں کر سکتے ... اور نہ ہی میرے کسی کام میں دخل اندازی کر سکتے ہو۔ تمہارے حقوق کو دھکا پہنچائے بغیر میں سوربھ سے نہیں بول لیتی ہوں تو تم کیوں حسد کرتے ہو؟ کیا چھین لیا ہے اس نے تم سے تمہارا؟ کیوں اس سے خار کھاتے ہو؟ دھن دولت یا تمہارے حصے کی جائداد تو نہیں دے دی میں نے اُسے؟ تو تم سوربھ کی حالات کو تو سمجھتے نہیں، بس ماں باپ کی پناہ میں بیٹھ کر جلے دل کی پھپھولے پھوڑتے رہتے ہو۔

امول نے صاف الفاظ میں تو نہیں لیکن در پردہ موہنیش ہی کا ساتھ دیا۔ بولے "بیٹا اس طرح جھلائے ہوئے کیوں رہتے ہو؟ تم سوربھ سے اپنا مقابلہ کر کے خود کو نیچے گرا رہے ہو۔"

موہنیش نے کچھ نہ کہا، خاموشی سے اٹھ کر چلا گیا۔ اس نے سوچا تھا کہ پتا جی کھلم کھلا اس کی طرف داری کریں گے تو آج اس قضیے کو ختم کر کے ہی دم لے گا۔ ہمیشہ کے لیے سوربھ کا پتہ کاٹ دے گا ... مگر امول ٹھہرے وکیل ... وہ مخالف کو زیر کرنے میں عجلت نہیں کرتے مدلل بحث کا سہارا لے کر مخالف کو شکست دیتے ہیں۔

موہنیش کو جاتے دیکھ کر امول کرشنا سے مخاطب ہوئے۔ "کوئی بھی بات ایک حد تک ہی اچھی لگتی ہے۔ جب تم جانتی ہو کہ موہنیش سوربھ کے نام سے بھڑکتا ہے تو کیوں اس کے سامنے اس کا ذکر کرتی ہو۔ سچ پوچھو تو مجھے بھی ان چھوٹے لوگوں سے تعلق رکھنا پسند نہیں۔ مگر میں اپنے جذبات پر قابو رکھ سکتا ہوں، موہنیش ابھی ناسمجھ ہے۔ تمہیں اس طرح اس پر خفا نہیں ہونا چاہیے۔ ہاں ... قانون کی کیا بات کر رہی تھیں تم؟ کس کے نام ہے وہ مکان؟"

کرشنا خاموشی سے چائے کی چسکیاں لیتی رہی۔ اموں کے خیالات سے آگاہی نے اُسے اندر تک غم زدہ کر دیا تھا۔ اتنا دکھ اسے موہنیش کے مسلسل اختلافات ظاہر کرنے سے بھی نہیں ہوتا تھا۔ موہنیش کا اختلاف اس کی سمجھ میں آتا تھا۔ اموں کی بے اعتنائی اس کی فہم سے بالاتر تھی.... اس لیے اموں سے بات کرنا فضول تھا۔

سوربھ اس دن جو گیا تو لوٹ کر نہیں آیا۔ اس کے نہ آنے کی فکر کرشنا نے دل ہی دل میں کی۔ کسی کے (اموں اور موہنیش کے سوا گھر میں تھا کون؟) سامنے اس نے بے چینی کا اظہار نہیں کیا۔ سوربھ کبھی اتنے طویل عرصے تک غائب نہیں ہوا تھا۔ کرشنا نے بارہا عالم تصور میں ان واقعات کو تازہ کرنے کی کوشش کی تھی.... ان حالات کو سمجھنے کی کوشش کی تھی جن کا تذکرہ کر کے وہ کرشنا سے پناہ مانگ رہا تھا۔

کرشنا نے اس کی پوری بات بھی نہیں سنی تھی۔ صاف کہہ دیا تھا کہ اس کے شوہر اور بیٹا اس صورت حال کو پسند نہیں کریں گے۔ اب اسے اپنی ذات کی حقیقت کا علم ہو رہا تھا، اور خود پر رحم آ رہا تھا۔ وہ ماڈرن زمانے کی تعلیم یافتہ عورت ہے.... مگر اپنے حقوق سے باخبر ہوتے ہوئے بھی اتنی بے بس ہے کہ اپنے گھر میں کسی کو پناہ نہیں دے سکتی۔ شوہر اور بیٹا اس سے پوچھے بغیر گھر میں دو دو کتے پال سکتے ہیں جب کہ وہ بخوبی جانتے ہیں کہ کرشنا کو کتے پسند نہیں ہیں.... وہ کرشنا کی پسند ناپسند کا خیال کیے بغیر گھر میں کتے رکھ سکتے ہیں مگر کرشنا ان کی ناپسندیدگی کو مدنظر رکھ کر ایک انسان کے بچے کو پناہ نہیں دے سکتی۔ یہی دنیا ہے۔ لاکھ آزادیٔ نسواں اور مساوی حقوق کی بات کی جائے عورت اب بھی اسی مقام پر ہے جہاں صدیوں پہلے تھی۔ نعرے لگانے، جلوس نکالنے اور کھوکھلے دعوے کرنے سے کچھ حاصل نہیں۔ ضرورت ہے ذہنیت بدلنے کی۔ مرد کے دل و دماغ میں اپنی برتری کا احساس گہرائی تک بسا ہوا ہے.... عورت کو اپنے سے برتر یا کمتر سمجھنے کی نہیں اپنے برابر سمجھنے کی ذہنیت اور اس مطابق سلوک کرنے کی ضرورت ہے آج کے دور میں۔

ایک ٹھنڈی سانس لے کر بے دلی سے کرشنا نے لفافہ کھولا.... بغیر کسی القاب کے سوربھ نے لکھا تھا۔

میں جا رہا ہوں یہ شہر اور گھر چھوڑ کر۔ جاتے وقت آپ سے اس لیے ملاقات نہیں

کی کہ کہیں میرا ارادہ کمزور نہ پڑ جائے۔ میرا یہ عقیدہ کہ اس شہر میں اب میرا اپنا کوئی نہیں بچا شاید آپ کے سامنے پہنچ کر باطل ثابت ہو جاتا۔ پھر میں آپ کو بھی مجھے پناہ نہ دینے کی بے بسی کا شکار نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ لیکن یہاں رہنا بھی دو بھر ہو رہا تھا۔ اس لیے گھر ہی نہیں شہر بھی چھوڑ رہا ہوں کیسے کہوں آپ سے اب میرا گھر، گھر نہیں رہا۔ اب وہ لیلا بائی اور اس کے گاہکوں کا اڈہ بن گیا ہے۔ وہاں اب شام ڈھلتے ہی بوتلیں کھلتی ہیں۔ بازی اں جمتی ہیں اور عیاشی ہوتی ہے۔ دادی تو چند دن بھی یہ بے حیائی برداشت نہ کر سکی۔ میں ہی پتھر دل تھا جو وہاں دو ماہ گذار گیا۔ مگر اب آخری حد آ چکی ہے۔ ماں کے نہ رہنے پر دادی کے خیال سے میں اتنے دن اس گھر میں رہا اور نہ میرے لیے رکھا کیا تھا؟ پتا جی سے مجھے وراثت کے نام پر کیا ملا؟ شراب اور نالیوں کی غلاظت کی شراندھ.... مسلسل قے کرتے رہنے کے گھناونے عمل کو مجبوراً دیکھتے رہنے کی سوغات میرے حصے آئی.... میں نے یہ سب برداشت کیا صرف اس لیے کہ کیسے بھی ہیں، ہیں تو میرے جنم داتا.... مگر ایک وقت ایسا آیا جب میں لاچار ہو گیا.... دیکھا کہ جن گندگیوں سے میں ان کے جسم کو آلودہ ہوتے نہیں دیکھنا چاہتا تھا وہ گندگیاں لیلا بائی کی وجہ سے گھر ہی میں انہیں آلودہ کر رہی ہے تو میں ہمت ہار بیٹھا۔'' میں اس گھر کو۔ جو اب گھر نہیں قبرستان بن گیا ہے، چھوڑ کر جا رہا ہوں ہاں وہ گھر قبرستان ہی ہے اس میں ایک شوہر کی غیرت دفن ہے.... کیونکہ وہ اس بات کی خبر نہیں رکھتا کہ اس کی بیاہتا کب کس کی آغوش میں ہوتی ہے۔ وہاں ایک عورت کا وہ ازدواجی حق دفن ہے جو اس نے سراسر دھوکے سے حاصل کیا تھا (لیلا بائی نے غلط بیانی کی تھی کہ وہ پتا جی کے بچے کی ماں بننے والی ہے) اس کے گھر میں لیلا بائی کے پاس داد عیش دینے آنے والوں کی لاج شرم دفن ہے کیونکہ اپنے گھروں کو گلستاں بنائے رکھ کر وہ دوسروں کے گھروں کو چکلہ بناتے ہیں۔ اس قبرستان میں میری نامکمل خواہشات اور میرا بچپن دفن ہے جن کے تکمیل نہ پاتے اور جسے کھو دینے سے میں جیتے جی مر گیا۔ بھلا ایسے قبرستان میں کتنے دن چراغ جلائے بیٹھا رہنا ہے....؟ ایک آپ کا سہارا تھا.... وہ بھی چھوٹ گیا۔

''ممی! کس کا لیٹر ہے؟'' موہنیش کرشنا کے ہاتھ میں خط دے کر اس کے نزدیک چلا آیا۔ کرشنا نے خط اس کی طرف بڑھا دیا اور خود نڈھال سی کرسی کی پشت پر ٹنگ گئی۔ اب اسے موہنیش کے کسی الزام کا جواب دینے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ اس لیے خط اسے پڑھنے دینے میں کوئی حرج نہیں تھا۔

قبرستان
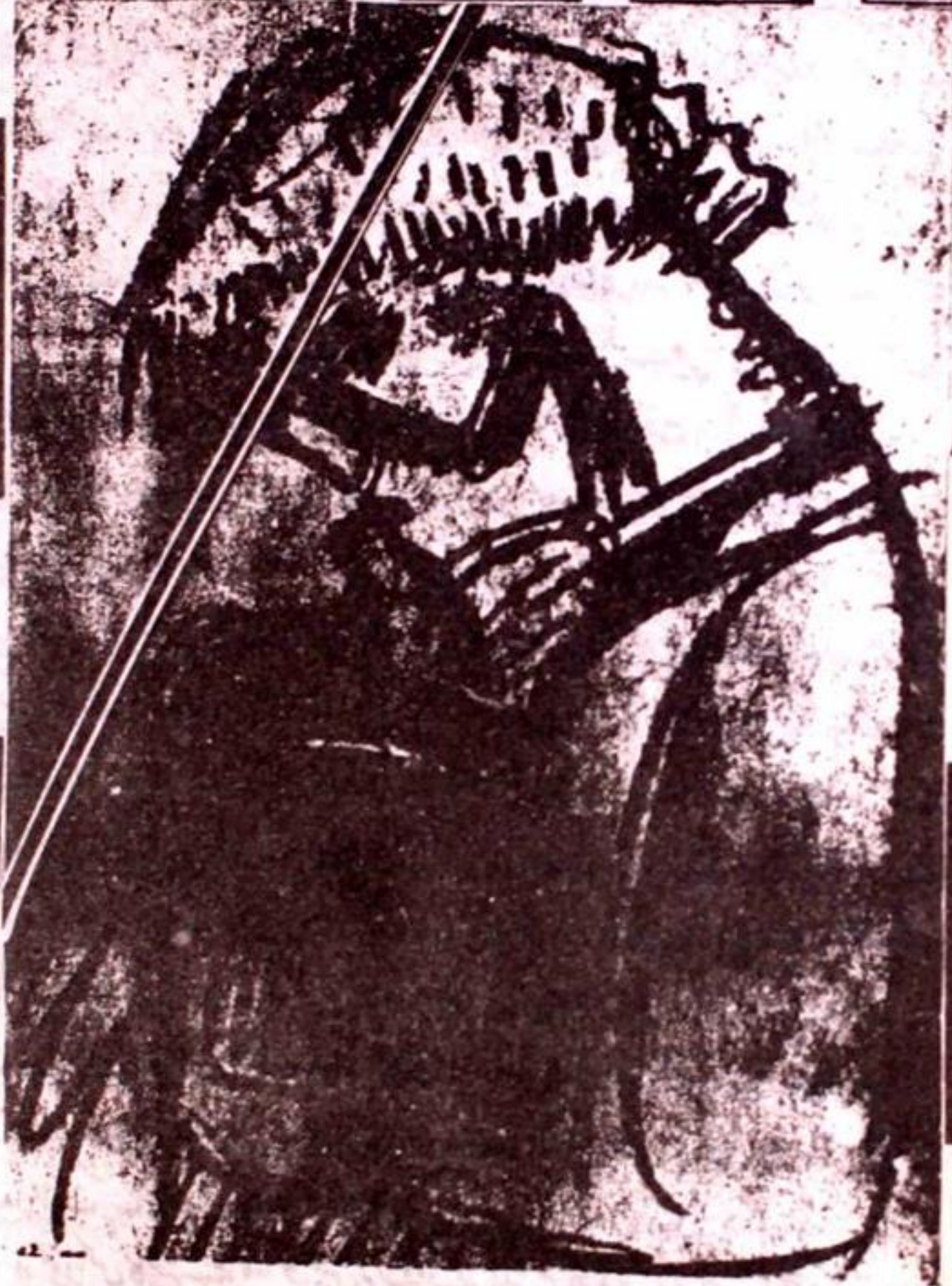
وسیع کمپاؤنڈ کے ایک کونے میں بنے ٹینس کورٹ پر شہزاد اور پپا کھیل رہے ہیں۔ سحر کھیل کر ابھی ابھی تھک کر بیٹھی ہے۔ ممی اندر کچن میں پنڈت کے ساتھ ڈنر کی تیاری میں مصروف ہیں۔ آج پپا کا برتھ ڈے ہے۔ ممی ان کی پسند کے پکوان بنا رہی ہیں۔ پپا کی پسند ناپسند ممی اتنے دنوں میں خوب جان گئی ہیں۔ یوں تو باپ بیٹا دونوں کھانے کے شوقین ہیں مگر پسند دونوں کی یکسر مختلف ہے۔ عمر ہو جانے کے بعد بھی پپا مرغن غذائیں پسند کرتے ہیں مگر شہزاد مرچ مسالوں سے گریز کرتا ہے۔ شہزاد کے وقت کا بیشتر حصہ آفس کی میز پر کام کرتے گذرتا ہے۔ اپنی صحت کی طرف سے وہ بے حد چوکس رہتا ہے اسی لیے ہلکی غذائیں پسند کرتا ہے۔ صحت دبلے پاپا کی بھی بری نہیں۔ پولس کے محکمے میں ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کے عہدے سے ملازمت شروع کی تھی اور ہر دم کی بھاگ دوڑ رہتی تھی اس لیے انھیں ان کے پتھر بھی ہضم کر لینا تھا سب ہیں۔

گھر میں اب دونوں کے لیے الگ الگ کھانا بنتا ہے۔ شہزاد تو کبھی پاپا کے کھانے میں سے اپنی پسند کی ڈش لے لیتا ہے مگر پپا اس کے کھانے کو بیماروں کی غذا کہہ کر ان کی طرف دیکھتے تک نہیں۔ سحر جانتی ہے آج ممی ڈنر پر شہزاد کی پسند کا کوئی

خیال نہیں رکھیں گی۔

سحرا بتدا ہی سے بے حد جذباتی رہی ہے۔ نہیں جذباتی کہنا ٹھیک نہ ہوگا۔ اپنی سوچ کے بھنور میں چکراتی رہتی ہے وہ۔ اس کی سوچوں کو بنانے میں اور اُسے اس میں گم کر دینے میں اس کے ماحول کو بہت دخل رہا ہے۔ سحر کو ننھے منے بچے بہت پسند ہیں۔ اس نے ممی سے بارہا کہا ہے کہ وہ کالج کی پرنسپل کیوں بن گئیں۔ کسی نرسری اسکول کی ہیڈ مسٹریس کیوں نہ ہوئیں۔ کم از کم بھائی بہنوں کے نہ ہونے کے اس کے دکھ کی تلافی تو ہو جاتی۔

سحر بھائی بہنوں کی کمی ہمیشہ محسوس کرتی آئی ہے جب بچے پیدا کرنے کے دن تھے تب ممی پپا، فیملی پلاننگ کرتے تھے۔ ایک وقت ایسا بھی آیا جب ممی اولاد حاصل کرنے کے لیے بڑے بڑے ڈاکٹروں کے پاس دوڑیں تب کہیں جاکر سحر پیدا ہوئی وہ دو سال کی تھی کہ پپا گذر گئے۔ ممی اب ملازمت سے سبکدوش ہو کر سحر کے پاس رہنے کے لیے آگئی ہیں۔

"میں تو بابا...." سحر اپنی سہیلیوں سے کہا کرتی "شادی کے بعد تین سال میں تین بچوں کو جنم دوں گی پھر فل اسٹاپ، میری بچوں کی خواہش پوری ہو جائے گی۔ بچوں کو ماں باپ کا پیار ملے گا۔"

سحر کی عادت بن گئی ہے کسی خاص واقعے سے دوچار ہونے پر وہ بیتے ہوئے حالات سے اس کا موازنہ کرنے لگتی ہے ایک شخص کی شناخت کو دوسرے کی پہچان میں گم کر دیتی ہے اور پھر ڈھونڈتی ہے ان کے درمیان کا فرق ممی اس کی اس عادت سے خوب واقف ہیں۔

ممی اے آئی۔ اے ایس میں بیٹھا نا چاہتی تھی۔ اس نے اسپانس نہیں دیا تو آئی۔ اے۔ ایس افسر داماد کے خواب دیکھنے لگیں..... "آئی اے۔ ایس افسر سے شادی کروں گی بے بی کی۔ آگے پیچھے نوکر ہوں گے۔ صاحبی ٹھاٹھ ہوں گے۔ پارٹیوں، فنکشنوں میں، سماجی کاموں کی مصروفیتوں میں بے بی کا ہر دم کا سوچنا، خیالات میں کھویا رہنا، بند ہو جائے گا۔"

سب کے اپنے اپنے آدرشس ہوتے ہیں اکثر والدین اپنا آدرش اپنے بچوں پر

تھو بنانا چاہتے ہیں۔ ممی اس سے مستثنیٰ نہیں تھیں۔ سحر بھی چاہتی تھی کہ کسی بڑے سرکاری افسر کی شریک حیات بنے۔ مگر اس کے پاس آئی۔ اے۔ ایس۔ آئی۔ پی۔ ایس یا آئی۔ ایف۔ ایس کی بندشیں نہ تھی۔ شادی کے بعد وہ ایک بھرا پرا گھر چاہتی تھی۔۔۔ صرف بیوی نہ بن کر بہت سارے رشتوں کو اوڑھ لینا چاہتی تھی۔۔۔۔ ایسا خاندان جو، نندوں، دیوروں جیٹھ جیٹھانیوں، چچیا دیا پھوپھی ساسوں سے بھرا ہوا ہو۔۔۔۔ جہاں وہ دلہن بن کر جائے تو بہت سے بچے ممانی، چچی کہہ کر اسے پکاریں، اس کا گھونگھٹ اٹھا کر شوق اور تجسس سے اسے تکیں، سسر اور جیٹھ اس کے پکائے کھانوں کی تعریف اور فرمائش کریں، ساس نکتہ چینی چاہے ضرور کرے مگر اس کے ساتھ لاڑ پیار بھی جتائے۔۔۔۔ بہت سے رشتہ دار جن کے درمیان مدت سے سوکھی پڑی اس کے دل کی دھرتی لہلہا اٹھے۔ اس کی زندگی میں بھائی بہنوں کے پیار سے جو خلا بن گیا ہے وہ سسرالی رشتہ داروں کے پیار سے ہر بھرا نخلستان بن جائے۔ محبت کی جو کونپلیں اس کے دل میں پھوٹیں وہ تناور درخت بن کر ڈھیر سارے لوگوں کو محبت و شفقت کا سایہ بخش دیں۔

شہزاد ممی کے کالج کے ایک فنکشن میں بطور مہمان خصوصی مدعو تھا۔ سامنے کی قطار میں بیٹھی ہوئی کھوئی کھوئی بلی کی سی آنکھوں والی سحر اسے بھا گئی۔ شہزاد کے پپا باقاعدہ پیغام لے کر آئے تو ممی کے پاؤں زمین پر نہ پڑتے تھے۔ ان کے خواب کی اتنی جلد تعبیر مل جانے کی انہیں امید نہ تھی۔ شہزاد آئی اے ایس تھا۔ خوبصورت اور اسمارٹ، ریٹائرڈ پولیس سپرنٹنڈنٹ باپ کا چھوٹا بیٹا۔ والدہ انتقال کر چکی تھیں۔ ایک بڑے بھائی تھے۔ بہزاد، چار برس ہوئے بیوی بچوں کے ساتھ امریکہ جا بسے تھے۔ وہیں کی شہریت اختیار کر لی تھی۔ ممی اس پیغام سے خوش تھیں۔ پپا اپنے بیٹے کی پسند سے مطمئن تھے۔ شہزاد نے خود اسے پسند کیا تھا۔۔۔۔ سحر اختلاف بھی کرتی تو کس بنا پر۔

شادی ہو گئی، سحر خوش تھی۔ بڑے بھیا بہزاد، جیٹھانی کونترا اور ان کے بچوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا اسے اتنا پیار، اتنی شفقت دی کہ ڈھیر سارے رشتہ داروں کے نہ ملنے کی کمی اسے کھلی نہیں۔۔۔ ان لوگوں کے امریکہ جانے کے بعد سحر کو ان کی جدائی شاق گذرنے لگی۔ شہزاد نے ہر ممکن تلافی کی۔ آہستہ آہستہ سحر شہزاد کی مصروفیات کے ساتھ خود کو ڈھال لینے میں کامیاب ہو گئی۔ ضلع کا دورہ مختلف پروگراموں کی صدارت، ان میں شمولیت۔۔۔

ضلع کی ذمہ داری، تمام میں سحر اس کا سایہ بنی رہتی۔۔۔ جب وہ فرصت میں ہوتا تب شہزاد سحر کا سایہ بن جاتا۔۔۔ بس اس کا ہو کر رہتا، اس سے باتیں کرتا، اس کی خاطر فلمیں دیکھتا اس کی بچکانہ خواہشات کی تکمیل کرتا۔

سحر، بر گھر بلو ذمہ داری نہیں کے برابر ہے وہ صرف نگرانی کرتی ہے۔ دو چپراسی تمام دن ڈیوٹی بدل کر رہتے ہیں۔ کھانا بنانے کے لیے پنڈت ہے۔ دس سالوں سے اس بنگلے میں کام کرتے کرتے وہ صاحبوں کا مزاج داں بن گیا ہے، نئے صاحب کے آمد کے کچھ ہی دنوں میں، صاحب سے ایک مختصر اور انفارمل انٹرویو کے بعد وہ ان کی پسند ناپسند جان لیتا ہے۔۔۔ ملک کے ہر خطے کے کھانے وہ بنا لیتا ہے غیر ملکی کھانوں کا بھی ماہر ہے۔۔۔ ہاں اگر واقف نہیں ہے تو گوشت کے ذائقے سے، گوشت کے پکوانوں کو ہاتھ تک نہیں لگاتا۔ کہتا ہے۔۔۔ "بابی صاحب" اس کو ہاتھ نہیں لگائیں گے، باقی بولو تو چوبیس گھنٹے آپ کی سیوا کرنے کو تیار ہیں۔ رسوئی کیا جھاڑو بوٹھا بھی کر دینے کو تیار ہیں۔

کمشنر صاحب کا لنچ ہو، ڈی آئی جی کا ڈنر ہو یا کسی کلکٹر یا سی او کی فیرول پارٹی، گوشت کی تمام چیزیں سحر ہی کو بنانی پڑتی ہیں۔ باقی رہ بھی کیا جاتا ہے پھر۔۔۔ سامنے ہی کلکٹر کا بنگلہ ہے۔ گذشتہ مرتبہ جو بنگالی کلکٹر تھے ان کی وائف نے اس بنگلے کے پنڈت کو ماس مچھلی پکانا کھانا سب سکھا دیا تھا۔ پتہ نہیں کون سی جادو کی چھڑی گھمائی تھی۔۔۔ جادو وادو کی بات تو برسبیل تذکرہ آ گئی ورنہ بات صرف اتنی تھی کہ کلکٹر کے بنگلے کا پنڈت نیا نیا اتر پردیش سے آیا تھا۔ نوجوان تھا۔۔۔ بہکاوے میں آ گیا۔ سحر کے یہاں جو پنڈت ہے وہ ادھیڑ عمر کا ہے، پکی اتنی آسانی سے مٹ جاتی ہے

سحر سے سب ملازم خوش رہتے ہیں، تلخی اور تکبر اس میں نام کو بھی نہیں ہے اپنے میٹھے بولوں سے وہ نوکروں سے ان کی ڈیوٹی کے اوقات سے زیادہ کام کروا لیتی ہے۔ بڑی بڑی پارٹیوں کے لیے وہ جیپ ڈرائیور یا جگ موہن مالی سے شامی کباب کے لیے گوشت پیسنے کو کہے تو وہ انکار نہیں کرتے۔ چائنیز ڈشز تیار کرنا اسے جیپ ہی نے سکھایا ہے، خالص بہار انٹر بن کھانا تیار کرنے کے لیے وہ آفس کے کسی کلرک کی بیوی کو بلا لیتی ہے۔ جب یہ سب مصروفیات نہیں ہوتیں تو وہ گھنٹوں آنگن میں کرسی ڈالے بیٹھی

سرونٹس کوارٹر کے مکینوں سے غائبانہ طور پر متعارف ہوتی رہتی ہے۔ صاحب لوگوں کے گھروں میں جو کچھ ہوتا ہے ملازم اسے کنکھیوں سے دیکھتے ہیں اور کھلے الفاظ میں سب سے کہتے پھرتے ہیں۔ صاحب لوگ نوکروں کے گھروں میں کھلی آنکھوں سے دیکھتے ہیں مگر اظہار نہیں کرتے۔ وقار آڑے آجاتا ہے۔ سب اپنے معیار اپنے ذوق اپنی استطاعت کے مقدور بھر باتیں کرتے ہیں۔ ملازمین کے تئیں صاحب لوگوں کی بات سب سے دلچسپ موضوع ہوتا ہے۔ صاحب لوگ ملازمین کے بارے میں بات نہیں کرتے اس کے سوا ان کے پاس اور بہت سے موضوع ہوتے ہیں۔

سحر کے بنگلے کے پچھواڑے آوٹ ہاؤس سے لگ کر ملازمین کے سرکاری کوارٹرس ہیں۔ کل چار مکان ہیں پہلے نمبر کے کوارٹر میں ہوم گارڈ بابولال رہتا ہے۔ اس کی پتنی بملا گھر کے کاموں کے ساتھ ساتھ مزدوری بھی کرتی ہے۔ پانچ روپے روز کما لیتی ہے۔ اس علاقے میں آئے دن گورنمنٹ کوارٹرس تعمیر ہوتے رہتے ہیں اس لیے بملا کبھی خالی نہیں رہتی۔ سحر اس جوڑے کو مثالی جوڑا مانتی ہے۔ وہ دونوں ہی بڑے محنتی اور جفاکش ہیں۔ تین بچے ہیں، تینوں اسکول جاتے ہیں، بڑا لڑکا دسویں میٹرک میں میرٹ میں آیا ہے۔۔۔۔ دوسرے کوارٹر میں کلکٹر آفس کا ایک چپراسی رہتا ہے رحیم خان۔ دن بھر میں اوپر کی کمائی سے جو کچھ ہاتھ آتا ہے رات کو اس کی شراب پی کر آتا ہے اور بیوی کو خوب مارتا ہے۔ تیسرے نمبر کے کوارٹر میں کلکٹر کا پنڈت رہتا ہے۔ اس کی لگائی ذرا ذرا سی بات پر پڑوسیوں سے جھگڑا کرتی اور بھدی گالیاں بکتی ہے۔ غصہ اتنی ہے کہ اپنے بچوں کو بھی روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیتی ہے۔ سحر کے دل میں ایک بار یہ خیال آیا تھا کہ اگر رحیم خان اور پنڈت کی لگائی میاں بیوی ہوتے تو کیا نقشہ ہوتا ہے اس گھر کا؟ چوتھے نمبر کے کوارٹر میں۔۔۔ جو سحر کے بنگلے کے پچھواڑے کے آنگن سے لگا ہوا ہے۔۔۔۔ پربھاکر راؤ اور اس کا خاندان گذشتہ پندرہ برسوں سے رہ رہا ہے۔ پربھاکر راؤ آر۔ ڈی۔ سی۔ آفس میں ملازم ہیں۔

سحر دو سالوں سے پربھاکر راؤ کو دیکھ رہی ہے۔ رات کو آر۔ ڈی۔ سی کے بنگلے کی ڈیوٹی ہوتی ہے ان کی ٹھیک آٹھ بجے گھر سے چل پڑتے ہیں۔ سردی، گرمی، برسات میں وہی یکساں لباس سفید سفید کرتا پاجامہ اور سر پر سفید گاندھی ٹوپی۔ بارش کے دنوں میں ایک پیوند لگی چھتری کا اضافہ ہو جاتا ہے تو سردی کی راتوں میں کئی جگہ سے

اُدھڑے بے رنگ سویٹر اور مفلر کا، پاؤں میں چپل کبھی ہوتی ہے کبھی نہیں ہوتی۔ برسات کی بھیانک اندھیری راتوں میں جب اکثر ہی اسٹریٹ لائٹ غائب رہتی ہے وہ اپنے خیالوں میں مگن چلے جاتے ہیں اسی طرح جیسے چاندنی راتوں میں بے نیاز ہوتے ہیں۔ نہ موسم کے بھیانک پن کا ان پر اثر ہوتا نہ موسم کی دلکشی انہیں متاثر کرتی۔

آٹھ بجے اکثر سحر شہزاد کے انتظار میں بڑے گیٹ پر آنکھیں لگائے اور ہارن کی آواز پر کان دھرے بیٹھی ہوتی ہے۔ جیکب تجربہ کار اور زمانہ شناس آدمی ہے۔ شہزاد کو لے کر لوٹتے ہوئے وہ دُور ہی سے ایک خاص انداز میں ہارن بجاتا ہوا آتا ہے ڈیوٹی پر موجود ہیرامن اور وٹھل اس ہارن کو پہچان کر گیٹ کھول کر تیار ہو جاتے ہیں اپنے صاحب کا استقبال کرنے کے لیے۔ سحر کی بھی کلی کلی کھل اٹھتی ہے۔

شہزاد نے ایک مرتبہ جیکب کو منع کیا تھا۔ ”سول لائنز میں داخل ہونے کے بعد اتنے زور سے ہارن بجانے کی کیا ضرورت ہے؟ سول لائنز میں سڑک پر کوئی ہوتا نہیں؟“

”وہ تو میم صاحب کے لیے بجاتا ہوں۔“

”میم صاحب کے لیے؟“ سمجھا نہیں تھا شہزاد۔

”میم صاحب سات بجے سے آپ کا انتظار کرتی ہیں۔ میں ہارن بجا کر ان کے انتظار کے لمحات کچھ کم کر دیتا ہوں۔“

”تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ میم صاحب میرا انتظار سات بجے سے کرتی ہیں؟“

”ہیرامن اور وٹھل بتاتے ہیں صاحب۔“ جیکب مونچھوں میں مسکرا رہا تھا۔

شہزاد کو اپنی شریک حیات پر بہت پیار آیا۔ بہت فخر ہوا..... کچھ افسوس بھی ہوا کہ وہ اس پیار کا خاطر خواہ جواب نہیں دے پا رہا ہے۔ نئے شہر میں پرموشن پر آیا تھا۔ کام بہت زیادہ تھا۔ وہ مقبول افسر تھا۔ عوام نے اس سے بہت سی توقعات وابستہ کر رکھی تھیں۔ وہ ان توقعات پر پورا اترنا چاہتا تھا۔ شہر کے ذی حیثیت لوگوں نے ایم۔ ایل۔ اے کی معرفت منسٹر تک یہ درخواست پہنچائی تھی کہ اس غیر ترقی یافتہ علاقے کی ترقی کے لیے یہاں شہزاد جیسے حوصلہ مند نوجوان افسر کی اشد ضرورت ہے..... جو پوری لگن اور محنت سے کام کرتا ہے وہ افسران جو رفتہ رفتہ ترقی کر کے اس عہدے تک پہنچتے ہیں ان کے پاس تجربہ ضرور ہو جاتا ہے مگر کام کی وہ لگن وہ حوصلہ ان میں نہیں ہوتا۔

جیکب کی آواز نے شہزاد کے خیالات کا تسلسل توڑ دیا۔۔۔۔صاحب، وہ آپ سے پہلے اشوک صاحب تھے نا۔ ان کی بیوی صاحب کی بالکل پروا نہیں کرتی تھی۔ اس لیے اپنی بیم صاحب کو آپ کا انتظار کرتے دیکھ کر ہمیں اچھا لگتا ہے۔

شہزاد سے عموماً دھر ادھر کی باتیں کرنے کی ان لوگوں کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ پتہ نہیں یہ سب بھی جیکب کس دھن میں کہہ گیا تھا۔ سحر سے البتہ وہ سب کھل کر بول لیتے۔۔۔۔ یہ بات سحر سے شہزاد کو معلوم ہوئی تھی۔ آفس کے لوگوں نے بھی بتایا تھا کہ اشوک صاحب کی بیوی بہت ہی خرانٹ اور بدمزاج عورت تھی۔ فلمیں دیکھنا، انگریزی ناول پڑھنا۔ سیر سپاٹے کو جانا، اشوک صاحب سے لڑنا اس کے پسندیدہ مشغلے تھے۔ اشوک صاحب کی ذرا بھی نہیں چلتی تھی۔ نوکروں کے سامنے انہیں ذلیل کرتی، آفس میں پہنچ جاتی آفس کے معاملات میں دخل دیتی اشوک صاحب بے چارے شرافت میں مارے جاتے۔

سحر جب شہزاد کا انتظار کرتی رہتی ہے تبھی پربھاکر راؤ اپنی رات کی ڈیوٹی پر جاتے ہیں۔ سحر کے گیٹ کے سامنے ہی سے گذرنا ہوتا ہے۔ انہیں کام سے ان کی زندگی عبارت ہے۔ رات کی ڈیوٹی ہونے کی وجہ سے دن کو انہیں چھٹی ہوتی ہے شام چار بجے سے وہ باغیچے میں مصروف نظر آتے ہیں۔ بدن پر صرف پاجامہ۔۔۔۔اوپر کا بدن برہنہ، کوتے کا کوارٹر ہونے کی وجہ سے انہوں نے بہت سی جگہ گھیر رکھی تھی۔ سیم کی پھلی اور لوکیوں سے لدے منڈوے، بیگن اور گوبھی کے پودے۔۔۔۔ سبھی کچھ لگا رکھا ہے شہزاد جب گوشت مچھلی انڈے کھاتے ہوئے اکتا جاتا ہے تو سحر پربھاکر راؤ کے گھر سے تازہ سبزیاں منگا لیتی ہے۔ دام واجبی اور کوالٹی عمدہ سحر جب پربھاکر راؤ کو باغیچے میں کام کرتا ہوا دیکھتی ہے اس کے ذہن میں پپا آ جاتے ہیں۔۔۔۔ شہزاد کے پپا اس کے خسر ہیں۔

شہزاد کے پپا ریٹائرڈ پولس سپرنٹنڈنٹ پرتاپ گڑھ کے ایک زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ زمینداری گئی تو سرکاری ملازمتیں اختیار کر لیں۔ شہزاد کے دادا جان نے آزادی کی جنگ میں حصہ لیا تھا۔ کچھ دیر جیل میں بھی رہ آئے تھے۔ شہزاد کے پپا کو آزاد ہندوستان میں پولس کی افسری دلوانے میں ان کو ائف نے کافی مدد کی تھی۔ پپا کی صحت بے حد شاندار تھی۔ پچاس سے زیادہ کے نہیں لگتے تھے۔ چڑھی ہوئی گھنی

مونچھیں، پٹھانوں کا سا ڈیل ڈول، ہر دم کھلا کھلا سرخ سفید چہرہ۔ انہیں بات بات پر قہقہے لگانے کا شوق تھا۔ صبح اٹھ کر ایک کلومیٹر کی دوڑ لگانے۔ باقاعدہ ورزش کرتے شہزاد نے پپا سے ان کی شاندار شخصیت پائی تھی۔ سنجیدگی اور بردباری ماں سے پائی تھی۔ شہزاد ہو بہو باپ پر گئے تھے۔ یہ دونوں باپ بیٹے جس محفل میں ہوتے وہاں کوئی شخص بھی سنجیدہ نہیں رہ سکتا تھا۔

سحر کے ذہن میں پپا اور پربھاکر شخصیتیں گڈمڈ ہوتی رہتیں۔ پربھاکر راو جسمانی طور پر کمزور اور زیادہ بوڑھا ہے پھر بھی ملازمت کرنے پر مجبور ہے۔ پپا صحت مند ہیں، کوئی بھی پرائیوٹ ملازمت کر سکتے ہیں مگر نہیں کھیل کر دن گذار رہے ہیں۔ ان کے بیٹے انہیں کوئی کام نہیں کرنے دیتے ہیں پپا ایک بہو سحر پر جان چھڑکتے ہیں اسے بہو سے زیادہ دوست مانتے ہیں۔ پربھاکر راؤ اور ان کی بہن میں ہمیشہ تناتنی چلتی ہے۔ اس بہو نے ان کی زندگی تلخ کر رکھی ہے۔ پپا کی زندگی میں آرام ہی آرام، پربھاکر راؤ کی زندگی ذمہ داریوں کے بوجھ سے مرتی سسکتی ۔۔۔۔ زندگی کا مذاق اڑاتی ہوئی۔

پربھاکر راؤ اس زمانے میں ملازمت پر لگے تھے جب کلاس فور ملازمین کے لیے عمر کی کوئی بندش نہ تھی۔ برتھ سرٹیفکٹ مانگا جاتا تھا نہ علمی قابلیت دیکھی جاتی تھی۔ پنشن کا قانون بنا تو پرانے ملازمین سے تاریخ پیدائش جاننے کے لیے برتھ سرٹیفکٹ مانگا گیا۔ بہت سے لوگوں نے گاؤں قصبوں کی پنچایت کمیٹیوں سے سرٹیفکٹ حاصل کرتے ہوئے اپنی عمروں میں کٹوتی کروالی جس سے ملازمت میں زیادہ عرصہ بنے رہ سکیں ۔ شہزاد نے ایک مرتبہ سحر کو بتایا تھا کہ اس کے آفس میں دو باپ بیٹے ایسے ہیں جن میں بیٹا باپ سے زیادہ عمر کا ہے یعنی کاغذات میں بیٹے کی عمر پچپن اور باپ کی عمر پینتالیس سال لکھی ہوئی ہے۔ بیٹا عنقریب ریٹائر ہو جائے گا جبکہ باپ کی ملازمت کے پندرہ بیس سال باقی رہ جائیں گے۔ سحر ہنسی تھی اس لطیفے پر۔

پربھاکر راؤ ان دنوں نیمل تھے۔ ان کا بیٹا بھیم راؤ سرٹیفکٹ لینے رتناگیری ضلع کے ایک دور افتادہ گاؤں میں گیا اور باپ کی عمر کم لکھا لایا۔ پربھاکر راؤ خوش ہی ہوئے کہ اب دو برس بعد ملازمت سے سبکدوش نہ ہونا پڑے گا۔ وہ دراصل گھر میں زیادہ رہنے سے کتراتے تھے۔ بیٹا ایک ہی تھا ان کا۔ بھیم راؤ اس سے چھوٹی دو لڑکیاں۔ بھیم راؤ کو

تعلیم دلانے کی انھوں نے بہت کوشش کی مگر بھیم راؤ کا من پڑھنے میں نہ لگا تین بار میٹرک میں فیل ہوا کسی طرح وہاں سے نکلا تو سائنس پڑھنے کی ضد میں دو سال اور گنوا دیے۔ بی۔اے۔ میں داخلہ لیا وہاں میں ناکامیاب۔ پربھاکر راؤ کی ہمت جواب دے گئی آر۔ ڈی۔ سی صاحب سے کہہ سن کر اسے بھی چپراسی لگا دیا۔ ان کی پتنی گائتری کو بھولانے کا بڑا ارمان تھا۔ بھیم راؤ کے نوکری پر لگتے ہی بڑے چاؤ سے بہو لے آئی۔ وہ بدزبان اور جھگڑالو نکلی۔ ساس سسر اور دونوں نندیں اس کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتیں۔ بھیم راؤ سرٹیفکٹ لے کر آیا تو گائتری کے من کو چوٹ لگی۔ سحر اس وقت آنگن میں بیٹھی تھی۔

گائتری نے دل کی بات ہونٹوں سے کہہ دی تھی "بیٹا تمہارے پتا اب تھک گئے ہیں۔ تم نوکری سے لگ گئے۔ گھر سنبھال لیتے، انہیں آرام کرنے دیتے۔

بہو چمک کر بولی تھی۔ "آرام کرنے دیتے؟ اور جو یہ دو دو بیٹیاں چھاتی پر بیٹھی ہیں، انہیں کون پار لگائے گا؟"

"گائتری نے اداس ہو کر کہا تھا" ایسا نہ کہو بہو۔ ان کا جو کچھ فنڈ وغیرہ ملتا اسی میں نبٹا لیتے سب۔"

"اور تم؟ بہو تڑاک سے بولی تھی "تمہارا خرچ کون پورا کرے گا؟ جمع جتھا بھی لٹا دو گے تو؟"

گائتری حیرت سے بولی "کیا؟ بیٹا، بہو کیا ماں باپ کو نہیں کھلا سکتے؟ اسی دن کے لیے ہم نے پال پوس کر اتنا بڑا کیا تھا۔"

بھیم راؤ چپ چاپ کھسک گیا وہاں سے۔ بہو نے ہی اسے آ بنڈ باد دیا تھا اور بغیر کچھ سوچے سمجھے وہ پتا کی عمر میں کٹوتی کرا لایا تھا۔ اب وہی نپٹے ان لوگوں سے ...۔ بہو بڑبڑا رہی تھی۔ ایک کی کمائی میں چار جنے کھائیں گے۔ پھر ہمارے بال بچے نہیں ہوں گے، مہنگائی کمر توڑ رہی ہے ....، یہ تھی پربھاکر راؤ کی زندگی —— زندگی کا مذاق اڑاتی ہوئی۔"

ایک رات سحر نے پتہ نہیں کس ترنگ میں شہزاد کو اپنی سوچ میں شامل کر لیا تھا۔ شہزاد کچھ دیر تک اسے حیرت سے تکتا رہا تھا، پھر اپنی طرف کھینچ کر کہا تھا —!" سحرو! تو بچی ہے بالکل ماں بچے کو چاند کو ماما کہنا سکھاتی ہے لیکن جب بچہ پوچھتا ہے

کہ یہ کیسے ماما ہیں جو ہم سے کھلنے نہیں آتے تو ماں لاجواب ہو جاتی ہے۔ میں تمہیں تمہارے سوال کا کیا جواب دوں۔؟ کیا بتاؤں کہ ایسا کیوں ہے؟ فاصلوں کی حقیقت تمہیں کیسے سمجھاؤں؟ سب اپنے اپنے حالات کے اسیر ہوتے ہیں یہ بھی تو ممکن ہے کہ پپا اپنی موجودہ حیثیت سے مطمئن نہ ہوں۔ اپنے زمانۂ ملازمت کا رعب و دبدبہ، عزت، ومرتبہ، شان اور شوکت انہیں یاد آتی ہو۔ ہو سکتا ہے بیٹے کی افسری سکو و سیع آسمان کے نیچے وہ خود کو پر کٹے پرندے کی طرح پاتے ہوں.... مگر خدا کے لیے تم ایسی اوٹ پٹانگ باتیں نہ سوچا کرو.....

سحر خاموش ہو گئی تھی مگر شہزاد نے پپا سے متعلق جو ایک خیال ظاہر کیا تھا وہ اس کے پیچھے چل پڑی۔ پپا کے دل کی تھاہ پانے کی اس نے کئی بار کوشش کی مگر ہر بار اپنے ہی خیالات سے ٹکرا کر واپس آگئی۔

پپا بولنے کی موڈ میں ہوتے تو وہ اس کا دل رکھنے کو بظاہر خوب دلچسپی لیتے۔ کبھی کبھی خود اصرار کرتی کہ پپا چمبل کی گھاٹیوں میں ڈاکوؤں سے ہوئی مڈبھیڑ کی روداد سنائیں پپا اپنے مخصوص دلکش انداز میں شروع ہو جاتے.... وہ کچھ دیر پورے دھیان سے سنتی پھر اپنے خیالات سے کبھی نہ ختم ہونے والے راستوں پر چل پڑتی۔

ممی دو ماہ پہلے ریٹائر ہوئیں تو سب سے پہلے اس سے ملنے آئیں۔ شہزاد اور پپا نے پھر انہیں لوٹنے نہیں دیا۔ شہزاد نے کہا تھا۔ "ممی اب مجھے اپنا بیٹا سمجھئے اور سحر کو بہو نہیں بیٹی۔ یہاں سے آپ کو کہیں نہیں جانا ہے"۔

سب خوش تھے سوا سحر کے۔ اسے ممی کا اپنے گھر مستقل رہ جانا پسند نہیں آیا تھا۔ وہ دراصل ممی کی موجودگی میں اپنے آپ کو بچی محسوس کرنے لگتی تھی۔ ممی اس کی سوچ پر چھینس اس کی نیند سوتیں اس کی نیند جاگتیں.... اس سے پہلے جب جب آئیں بوڑھی کاکی کو، جو شہزاد کی آیا تھی ڈھیروں ہدایتیں دے گئی تھیں۔ ــــ بے بی کو بھوک برداشت نہیں ہوتی۔ اس کی تلوؤں میں آٹھویں روز میں مہندی لگنی چاہیئے.... ایلوپیتھک دواؤں سے بے بی کو الرجی ہے.... اور نہ جانے کیا کیا ہدایتیں دے گئی تھیں کہ کاکی نے بھی اسے ہتھیلی کا پھپھولا بنا لیا۔ تمام دن وہ یہی دیکھتی رہتی کہ سحر کی آنکھیں لال تو نہیں، چہرہ پژمردہ سے تو کیوں ہے؟ طبیعت کے کسل مند ہونے کی وجہ کیا ہے؟ دن بھر میں اسے کتنی چھینک

آئی ۔۔۔ وغیرہ۔ شہزاد تو ناز برداری کرنا، شوہر کے فرائض اور حقوق میں گنتا تھا۔۔۔ سحر کا اپنا وجود کچھ نہیں رہ جاتا تھا۔ ممّی جب مستقل طور پر اس کے ساتھ رہنے لگیں تو اُسے موازنے کے دو نئے نکتے مل گئے۔ ممّی اور کاکی، کاکی اور ممّی وہی پاپا، اور پربھاکر راؤ کا سا معاملہ دیکھتی اور خیالوں میں دونوں کی حیثیت کا تعین کرتی وہ دونوں سحر کے خیالات سے بے خبر اس کی ناز برداری کئے جاتیں ہیں۔

عورت میں اپنے بچّوں کی حفاظت، پرورش وپرداخت کا جو فطری جذبہ ہوتا ہے وہ شوہر کی وفات ہو جانے کی صورت میں خاصا قوی ہو جاتا ہے۔ اُسے ہمیشہ یہ خدشہ رہتا ہے کہ اس سے کوئی کوتاہی نہ ہو جائے۔ بچے باپ کی کمی محسوس نہ کریں۔ ایسے بچّوں میں عموماً خود اعتمادی کی کمی ہوتی ہے اس کے برعکس بچّوں کی ماں کی وفات کے بعد، باپ، بچّوں کی پرورش ونگہداشت میں اسی خود اعتمادی کا مظاہرہ کرتا ہے جو شریک حیات کی زندگی میں اس کے مزاج اور شخصیت کا طرّہ امتیاز ہوتی ہے۔

شہزاد اور سحر ان متضاد حالات کی زندہ مثال تھے۔ سحر جہاں ہر بات، ہر فیصلے، اور ہر اگلے قدم کے لیے ممّی یا شہزاد کی طرف دیکھتی وہاں شہزاد اس طرح سے کامپلکس سے بالکل آزاد تھا۔

جب سے ممّی یہاں رہنے لگی ہیں سحر پاپا کے تئیں اپنے فرائض سے بے فکر ہو گئی ہے۔ علی الصبح ان کے لیے چائے بنانا، انہیں پالک کا سوپ بنا کر دینا، ان سے باتیں کرنا ان کی باتیں سُننا سب اس نے غیر محسوس طریقے سے ممّی کی طرف منتقل کر دیا ہے۔ پپا کو بھی ممّی کی شکل میں اس سے بہتر قاری، بہتر ساتھی مل گیا ہے۔ ممّی سویٹر بنتیں اور پپا کے ایڈوینچر سے بھرپور قصّوں پر ہوں ہاں کر کے، کبھی کبھار ایک دو فقرہ بول کر اپنی دلچسپی کا اظہار کرتی جاتیں۔

صورت حال میں یہ تبدیلی سحر کے لیے خوش کن ثابت ہوئی ممّی کی ہر دم کی بے بی بے بی کی تکرار کم ہو چلی تھی۔ سحر پپا کی بہت احسان مند تھی۔

ایک روز کی بات ہے شہزاد، دس دن کا کہہ کر ٹور پر گیا تھا۔ رات کو اسے واپس لوٹنا تھا وہ آیا نہیں، سحر کی تمام رات کروٹیں بدلتے گذری۔ سویرے سویرے

ہا کہیں آنکھ لگی تو دن چڑھے تک سوتی رہی۔ جب وہ جاگی تو اس نے ممی کو سرہانے بیٹھا پایا۔ وہ تشویش ناک نظروں سے اسے تک رہی تھیں۔

”بے بی پیاری!“ ”کیا بات ہے؟ کیوں اتنی دیر تک سوتی رہیں؟“

”اوہ؟ کچھ نہیں ممی!“ ”وہ انگڑائی لے کر بات چھپا گئی“

”پھر کیسے نہیں؟ آنکھیں سرخ ہیں، چہرہ پریشان ہے“

”ہو گا ممی“ ”وہ ٹال کر اٹھنے لگی تھی کہ ممی نے جھپٹ کر اسے سہارا دیا تھا۔

ٹھہرو بے بی! میرا سہارا لے لو۔ اوہ! تمہیں حرارت ہے۔ میں سی۔ ایس کو فون کر کے بلا لیتی ہوں۔“

سحر نے چارگی سے ممی کو دیکھا پھر جھپاک سے باتھ روم میں گھس گئی تھی۔ ممی نے اس کے جاگنے کے انتظار میں ناشتہ نہیں کھایا۔ سحر نے صرف کافی لینے پر اکتفا کی تو ممی کے حلق سے بھی کچھ نہیں اترا۔ سحر کسلمندی جا کر پھر بستر پر لیٹ گئی تھی۔ ممی شاید فون کرنے کے ارادے سے ڈرائنگ روم میں گئی تھیں۔ جب سحر نے پاپا کو کہتے سنا

”آپ سحر کو یوں بچوں کی طرح کیوں ٹریٹ کرتی ہیں۔ وہ اب بچی نہیں رہی“

ممی اس بیدھے استفسار پر بوکھلا گئی تھیں شاید“ سحر نے اسے محسوس کیا اور اٹھ کر ڈرائنگ روم کے دروازے تک چلی گئی۔

”کیا؟ کیا بات ہے؟ میں سمجھی نہیں“ ممی کا فون کی طرف بڑھتا ہاتھ رک گیا تھا۔ پپا سگار کا دھواں اڑاتے ہوئے بولے۔۔۔ ”مانا کہ وہ آپ کے لیے بچی ہے مگر اب وہ کسی کی شریک حیات ہے۔ جیسے آپ اس کی فکر کرتی ہیں، اسی طرح اسے بھی کسی اور کے لیے فکر مند ہونے کا حق ہے“

ممی خود کو سحر کی ذات سے پرے کبھی نہیں لے گئی تھیں۔ سحر کی ذات اب کسی اور کے گرد ہالہ کرنے لگی ہے یہ تو انہوں نے خواب میں نہ سوچا تھا۔ وہ سوالیہ نظروں سے پپا کو دیکھتی رہ گئی تھیں پپا مسکرا کر بولے تھے ”سامنے کی بات ہے۔ شہزاد کو رات ہی کو لوٹ آنا تھا۔ آیا نہیں۔ رات بھر پریشانی میں وہ سو نہیں سکی ہو گی۔ ابھی شہزاد آ جائے ہنستی کھیلتی اٹھ کھڑی ہو گی“

سحر کا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا۔ جی چاہا دوڑ کر پپا کے گلے لگ جائے۔ نفسیات

جو باپ کو بیٹی کا بہترین دوست گردانتی ہیں، غلط نہیں کہتی۔ پپا کی اس بات سے وہ پپا کی اور زیادہ گرویدہ ہوگئی۔ پپا نے اسی طرح کئی موقعوں پر اس کی شخصیت کو گھیرے، ممی کی بے جا شفقت اور محبت کے حصار کو توڑنے میں اس کی مدد کی۔

اس آزادی نے سحر پر اچھا اثر کیا۔ اس میں شوخی و شرارت، نیا حوصلہ اور جینے کی امنگ جاگی جس کا شہزاد نے نہایت گرم جوشی سے خیر مقدم کیا۔ جلد ہی گھر میں نئے مہمان کی آمد کی خبر نے خوشیاں بکھیر دیں۔

اس دن شام کو سحر نہایت دلجمعی سے ایک پارٹی میں جانے کی تیاری کر رہی تھی ان دنوں وہ یوں ہی دلکش ہو رہی تھی پھر آج اس نے کافی محنت سے خود کو سنوارا تھا۔ فیس پیک لگانے کے بعد وہ برسات کی سنہری دھوپ کی طرح نکھر آئی تھی۔ پپا اس کے برتھ ڈے پر بڑی خوبصورت جوڑے بارڈر کی گہرے نیلے رنگ کی کانجی ورم کی ساڑی لائے تھے۔ ممی کے لیے بھی اسی طرح کی سرمئی رنگ کی۔ شہزاد نے فون پر پارٹی کے لیے تیار رہنے کی تاکید کے ساتھ وہی ساڑی پہننے کی فرمائش کی تھی۔ سحر گنگناتی ہوئی بالوں کو پف کر رہی تھی کہ ڈرائنگ روم سے آتی ہوئی آوازوں نے اسے متوجہ کر لیا تھا۔

پپا کسی مجرم کی کہانی سنا رہے تھے جس نے ایک مکان سے چھ لاکھ روپئے کے زیورات اور نقدی چرائی تھی۔ پکڑا گیا تھا مگر مال برآمد نہیں کر رہا تھا۔ سب ہار گئے تھے تب پپا نے بڑی حکمت عملی سے اسے اعتماد میں لے کر مال برآمد کرا لیا تھا۔

ممی اپنے کالج کی ایک لڑکی کا واقعہ سنا رہی تھی۔ اس وقت وہ ہوٹل سپرنٹنڈنٹ تھیں۔ کسی طرح اس امیر گھر کی بگڑی لڑکی نے ہوسٹل کا ماحول خراب کر دیا تھا سب کا ناک میں دم کر دیا تھا۔ اس لڑکی کے والدین بھی اس سے عاجز آگئے تھے مگر ممی نے اسے سیدھا کر دیا تھا۔ ممی کو دیکھتے ہی کانپنے لگی تھی۔

ان دونوں کو یادوں کی دھند میں کھوئے ہوئے ماضی سے یادوں کے تحفے، چننے اور ایک دوسرے کو پیش کرتے دیکھ سحر کے دماغ میں مختلف خیالات تیزی سے گڈمڈ ہونے لگے۔ شہزاد کی کار کا ہارن سنائی دیا تو جلدی جلدی اس نے ساری لپیٹی۔

پارٹی سے وہ کافی رات گئے لوٹے۔ پپا اور ممی اپنے اپنے کمروں میں سونے جا چکے تھے۔ کپڑے تبدیل کرتے ہوئے قدِ آدم آئینے میں اپنے سراپا کو دیکھتے ہوئے سحر نے کہا۔

"آج کل ممی کتنی خوش رہنے لگی ہیں"

"خوش کیوں نہ ہوں گی۔ نانی جو بننے والی ہیں" شہزاد نے کہا۔ "پپا بھی بہت خوش رہنے لگیں ہیں وہ بھی تو دادا بننے والے ہیں" شہزاد نے رواروی میں کہا پھر شرارت سے پوچھا

"اور ہمارے بارے میں کیا خیال ہے حضور کا"

"میں کہہ رہی تھی ..." سحر نے بال کھول کر جھٹکتے ہوئے کہا۔ "ہم دونوں جس طرح ایک دوسرے میں گم رہتے ہیں اسی طرح ممی اور پاپا کو بھی حق مل جائے تو؟"

"کیا؟" شہزاد کے چہرے کی شگفتگی رخصت ہو گئی۔ وہ مجسم حیرت بن کر اسے دیکھنے لگا "کیا کہنا چاہتی ہو تم؟"

"میرا مطلب ہے دونوں کا نکاح ہو جائے تو ..."

"اف میرے خدا! تمہیں پتہ ہے سحر کہ تم کیا کہہ گئی ہو۔ اوہ نہیں! آخر تم نے کس بنا پر یہ بات کہی۔ کیا تم نے کچھ دیکھا؟" شہزاد کے ہاتھ سے مینگر چھوٹ پڑا۔

"کچھ دیکھا ہے کیا مطلب ہے تمہارا؟" سحر ناراضگی سے بولی تو شہزاد اچانک بپھر گیا۔ ٹائی موزے جوتے پھینک دیے اور کمرے میں تیزی سے چکر کاٹنے لگا۔ سحر نے اپنی شادی شدہ زندگی کے بائیس مہینوں میں پہلی مرتبہ شہزاد کو ناراض ہوتے دیکھا تھا .... اس کا ہاتھ تھام کر کچھ کہنا چاہا مگر اس نے ہاتھ جھٹک دیئے — سحر روہانسی ہو گئی۔

"میں نے صرف ایک بات کہی ہے۔ اسے اتنی سنجیدگی سے کیوں لے رہے ہو۔"

"تم ایسی فضول باتیں سوچتی ہی کیوں ہو؟" شہزاد گرم ہو کر بولا "عقل نہیں ہے تمہیں ذرا بھی میری ایک پوزیشن ہے .... ایک مقام ہے۔ اس اسکینڈل سے میری عزت خاک میں مل جائے گی۔ ہٹ جاؤ میری نظروں کے سامنے سے۔

سحر نے بستر پر لیٹ کر آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیے۔ انگلیوں کے درمیان کے رخنے سے شہزاد کو دیکھتی رہی۔ وہ کبھی ٹہلتا، کبھی آرام کرسی پر لیٹ کر کچھ سوچتا رہا۔

سویرے چلائے پی کر وہ پھر اپنے کمرے میں سوچ میں غلطاں بیٹھا رہا۔ دس بجے ہیرامن کو آواز دے کر فون اس نے اپنے کمرے میں منگوایا۔ پوسٹ آفس فون کر کے امریکہ ایک تار بھجوایا۔ طبیعت کی خرابی کا بہانہ کر کے پپا کو فوراً وہاں بلالو۔ تفصیلات خط میں لکھ رہا ہوں۔

سحر نے ایک طویل سانس لے کر پردہ چھوڑ دیا۔ بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی تھی۔ دوسرے روز کو نزبھابی کا تار آگیا۔ بہزاد سخت بیمار ہیں۔ پپا کو فوراً روانہ کر دو۔"

شہزاد نے بھاگ دوڑ کر کے پپا کے پاسپورٹ اور ویزا وغیرہ کی تمام تیاریاں مکمل کر دیں کل شام کی فلائٹ سے پپا کو جانا ہے۔ شہزاد تو آج ہی بھیجنا چاہتا تھا مگر سحر اور ممی نے روک لیا۔ آج کا پپا کا برتھ ڈے ہے۔

"میم صاحب سب لوگ کھانے پر آپ کا انتظار کر رہے ہیں" پنڈت کی آواز نے سحر کو چونکا دیا۔ اف وہ کبھی کبھی اسی طرح خالی الذہن ہو کر بیٹھی رہ جاتی ہے۔ شہزاد اور پپا کھیل ختم کر کے کب اندر گئے اسے پتہ ہی نہ چلا۔ سحر کھانے کی ٹیبل پر پہنچی۔ کھانا نہایت خاموشی سے کھایا گیا۔ سحر خاموش ہے مگر ہر ایک کے دل و دماغ میں جھانک کر اس کے خیالات پڑھنا چاہ رہی ہے اسے محسوس ہو رہا ہے پپا امریکہ جانا نہیں چاہتے۔ چاہتے ہیں انہیں کوئی روک لے شہزاد، سحر یا ممی۔ ممی کشمکش میں مبتلا ہیں جیسے پوچھنا چاہتی ہوں.... کب لوٹ کر آئیں گے آپ؟ شہزاد سوچ رہا ہے کب رات بیتے، دن نکلے ہو شام ہو۔ اور پپا یا فلائی کر جائیں۔ سحر نے شہزاد کے اس اقدام پر احتجاج کیا تھا۔ شہزاد نے کہا تھا۔ " میرے پاس مسئلے کا واحد حل یہی تھا۔ ممی کو میں نے یہاں رہنے کے لیے کہا ہے اب میں خود ہی انہیں جانے کے لیے نہیں کہہ سکتا وہ جائیں گی بھی کہاں؟ پپا کے دو بیٹے ہیں وہ کچھ عرصہ بہزاد بھائی جان کے پاس رہیں تو انہیں کیا فرق پڑتا ہے تب تک شاید یہ افیئر بھی ٹھنڈا پڑ جائے۔" سحر خود اپنی نگاہ میں ذلیل ہو گئی تھی۔ "تم بار بار کس افیئر کا ذکر کرتے ہو؟ میرے دل میں ایک بات آئی میں نے کہہ دی۔ حقیقت میں کچھ بات ہے یا نہیں اس کا پتہ تو لگا نے؟ خواہ دو بوڑھے انسانوں کو خوشی سے محروم کر رہے ہو۔"

"اس موضوع پر بات کرو سحر، پلیز! خدا نہ کرے ایسا کچھ ہو.... کچھ نہ ہو..."

سحر سوچ رہی ہے۔ ہر شخص اپنے اپنے دائرے میں قید ہوتا ہے اس سے باہر وہ نہیں جاتا۔ جا نہیں سکتا۔ جانا نہیں چاہتا۔ دائروں کے یہ قیدی صرف اپنے بارے میں سوچتے ہیں، اپنا بھلا چاہتے ہیں۔ دوسروں سے انہیں کیا۔

چور کے گھر چوری ہو جائے تو جو ردِ عمل چور پر ہو گا کچھ ویسی ہی حالت اس وقت انسپکٹر خان کی تھی۔ زخمی شیر کی مانند وہ کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ ہزاروں وسوسے اس کے ذہن میں جڑ پکڑ رہے تھے۔

مونا اپنی سہیلی کے ساتھ میٹنی شو دیکھنے گئی تھی۔ شو کے بعد دونوں نے اپسرا میں آئس کریم کھائی تھی۔ پھر بازار میں شاپنگ کی تھی اور پھر اپنے گھر جانے کے لیے جدا ہو گئی تھیں۔ رات کو دس بجے مونا کی سہیلی کو فون کرنے پر یہ ساری تفصیلات ملی تھیں۔ انسپکٹر خان کا فکر مند ہونا فطری تھا۔ مونا اب تک گھر نہیں پہنچی تھی۔

ایک سگریٹ جلا کر وہ پھر کمرے میں چکر کاٹنے لگا۔ مونا کے گھر نہ لوٹنے کے تعلق سے وہ ایک خاص لائن پر سوچ رہا تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے کسی واردات کی رپورٹ درج کرتے ہی وہ ایک خاکہ بنا لیتا تھا کہ واردات کس طرح ہوئی ہوگی۔ گرفتاری کے بعد مجرم یا تو اس کہانی میں خود ہی فٹ ہو جاتا تھا یا انسپکٹر خان جبراً اسے اپنی کہانی کا کردار بنا دیتا تھا۔ سوچتے سوچتے انسپکٹر خان نے کئی مرتبہ فون کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ مگر فوراً ہی پیچھے کھینچ لیا۔ قدم دروازے کی جانب بڑھے تو انہیں روک لیا۔ وہ اپنی سوچ کے دائرے کو قطعی شکل دینے
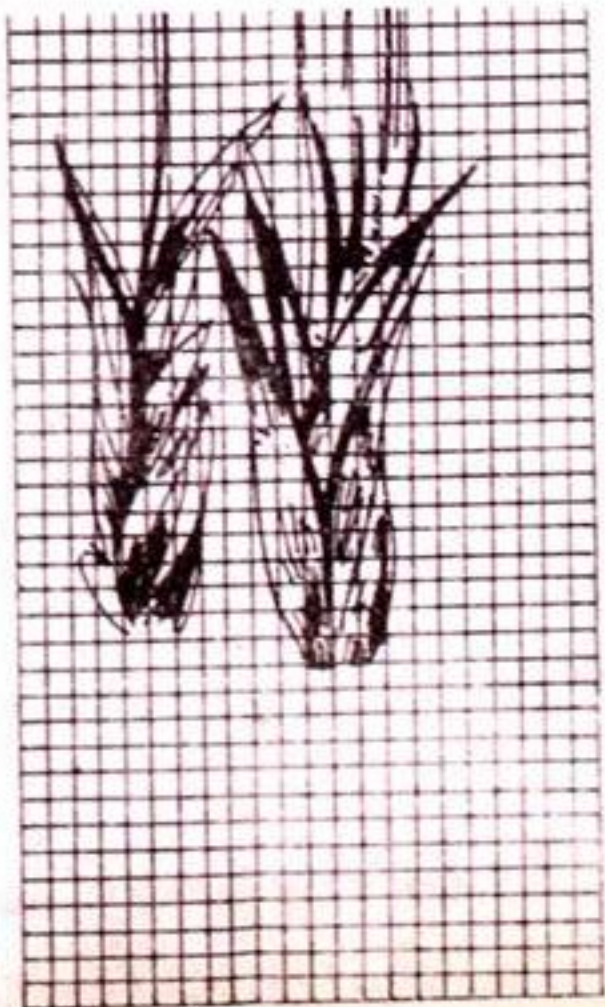
سے اجتناب کر رہا تھا.... مونا آخر اس کی بیوی تھی .... محبوب بیوی.

رات کے ساڑھے گیارہ بجے مونا کی سہیلی نے فون کر کے مونا کی خیریت دریافت کی پہلے تو انسپکٹر خان کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کہے. پھر نہ جانے کیسے غیر ارادی طور پر اس نے کہہ دیا۔ " ہاں مونا لوٹ آئی ہے. راستے میں اس کی آنٹی مل گئی تھیں. وہ ان کے ساتھ چلی گئی تھی. ابھی ابھی اس کا کزن اسے پہنچا گیا ہے. اس وقت وہ لباس تبدیل کر رہی ہے. صبح آپ کو فون کرے گی .... گڈ نائٹ!"

کبھی کبھی جو فیصلے انسان گھنٹوں کے غور و فکر کے بعد بھی نہیں کر پاتا. وہ فیصلے وقت منٹوں، سیکنڈوں، میں کرا دیتا ہے. مونا کی سہیلی کا فون نہ آتا تو کیا انسپکٹر خان کسی نتیجے پر پہنچ کر کہانی کو ایک دل کش لیکن پر فریب موڑ پر دے سکتا تھا؟ شاید نہیں! مونا کی سہیلی کے فون نے اندھیرے میں روشنی کی کرن کی طرح اپنی محبوب ہستی کی زندگی کے لیے اسے راہ سجھا دی تھی.

مونا کی موہنی صورت انسپکٹر خان کی آنکھوں میں گھوم رہی تھی. ان کی شادی کو دو برس بیت چکے تھے. مونا کے والد راجدھانی کے مشہور صنعت کار تھے. اپنی حسین و جمیل بیٹی کے لیے وہ اپنے ہم پلہ خاندان کا لڑکا ڈھونڈ رہے تھے مگر مونا نے اپنے بچپن کے ساتھی ــ جاوید خان کو ترجیح دی. باپ کی محبت نے بیٹی کی پسند کے آگے سر خم کر دیا.

مونا اپنے ساتھ دنیاوی آسائشوں کا مکمل سامان جہیز میں لے کر آئی. جاوید خان نے بھی اسے بھرپور پیار دیا. دونوں ایک دوسرے پر فدا تھے. ان کا خوبصورت سنسار وقت کی لہروں کے ساتھ سکون سے رواں تھا.

فرصت کے اوقات میں انسپکٹر خان مونا کو اپنی نوکری کے قصے سنایا کرتا جرم کا ارتکاب، گرفتاری، تھرڈ ڈگری کا استعمال، جرم کا اقبال، عدالتی کارروائی وغیرہ کے بارے میں مونا نہایت دلچسپی کا اظہار کرتی. اس کے لیے یہ سب بے حد حیرت انگیز ہوتا. فطرتاً وہ ایڈونچر پسند تھی. پھر اس کے خاندان میں دور، دور تک کوئی پولیس کی ملازمت میں نہ تھا.

موجودہ دور میں عورت کا مقام، الکٹران کے درمیان بحث کا موضوع بن جاتا. انسپکٹر خان کہتا " اس سے اچھا تو وہ دور تھا جب عورت گھر کی چار دیواری تک محدود تھی ۔

تب سماج میں اس کی عزت تھی۔ ایک مقام تھا۔ آج جس طرح عورت کی تذلیل ہو رہی ہے کیا وہ اس کی خود حاصل کردہ آزادی کا نتیجہ نہیں ہے؟"

مونا احتجاج کرتی "کیا ملاؤں جیسی دقیانوسی باتیں کر رہے ہو۔ درحقیقت مرد، عورت کی صلاحیتوں سے خوف زدہ ہے وہ ڈرتا ہے کہ عورت ہر میدان میں اس سے بازی نہ مار لے جائے۔ اقتدار عورت کے ہاتھوں میں نہ چلا جائے اس لیے وہ اُسے دوبارہ قدیم روایات کی زنجیروں میں جکڑنا چاہتا ہے۔ تم بھی مرد ہو، عام مردوں ہی کی طرح سوچتے ہو۔

انسپکٹر خان اس الزام پر کچھ شرمندہ ہو جاتا "مجھے غلط نہ سمجھو مونا۔ میں عورتوں کی آزادی کا قائل ہوں مگر اسی حد تک اسے آزادی دینا چاہتا ہوں جب تک وہ اسے ذلت کی پستی میں نہیں گرادیتی۔ پولس کی ملازمت میں رہنے سے میرے اس خیال کو تقویت ملی ہے کہ آج تک عورت کو سچی آزادی نہیں ملی.... آزادی کے نام پر صرف فریب ملا ہے۔ اسے گھر سے باہر نکلنے اور مردوں کے دوش بدوش کام کرنے کی آزادی دی گئی ہے تو عصمت دری کے واقعات بھی بے شمار ہو رہے ہیں۔ قدیم زمانے میں اُسے شوہر کی چتا میں زندہ جلا دیا جاتا تھا آج وہ آزاد ہے پھر بھی جہیز کے لیے زندہ جلائی جاتی ہے۔ پرانے وقتوں میں اُسے تعلیم نہیں ملتی تھی، وہ ڈھیروں جہیز نہیں لے جاتی تھی ملازمت کر کے روپیہ نہیں کماتی تھی آج ان سب کی اسے آزادی ہے مگر پھر بھی وہ ظلم کا شکار ہو رہی ہے کیوں؟ عورت کی نام نہاد آزادی سے درندہ صفت مردوں کو اس کا استحصال کرنے اسے بے عزت کرنے میں اور زیادہ آسانی مل گئی ہے.... ذرا غور کرو.. کیا یہی وہ آزادی ہے جسے وہ حاصل کرنا چاہتی تھی.."

مونا پوچھتی "تو کیا عصمت لوٹے جانے کے خوف سے عورتیں گھر سے باہر نکلنا چھوڑ دیں؟ اسکول کالج جانا ترک کر دیں؟ ملازمت ترک کر کے پردے میں بیٹھ جائیں؟ اپنی آزادی کو بالائے طاق رکھ کر کھانا پکانے، بچے پیدا کرنے اور پالنے تک اپنے کو محدود کر لیں.."

"میں نے ہرگز نہیں کہا، میں زمانہ قدیم اور آج کے دور میں عورتوں کی حیثیت کا مقابلہ کر رہا تھا.... پہلے کبھی کسی ایک سیتا کا ہرن (اغوا) کرنا تھا آج دن دہاڑے

بینائیں سڑکوں سے اٹھالی جاتی ہیں۔ پہلے کبھی ایک دروپدی کو سر دربار عریاں کرنے کی سعی ہوتی تھی آج عورت کو برہنہ اسٹیج پر نچایا جاتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں گھر کی چار دیواری کے محفوظ قلعے سے باہر نکل کر عورت نے خود ہی مرد کو اپنی بے عزتی کرنے کی ترغیب دی ہے۔"

"کوئی ضرورت نہیں ہے..... عزت لٹنی ہو تو گھر بیٹھے بھی لٹ جاتی ہے۔ سیتا کو راون سڑک سے اٹھا کر نہیں لے گیا تھا۔"

"بہت کڑوا بول رہی ہو....." انسپکٹر خان مسکراتا ہوا کہتا "یہ کیوں بھولتی ہو کہ سیتا جنگل میں دو مردوں کی حفاظت میں تھی۔ جب تک اس نے لکشمن ریکھا پار نہیں کی تھی تب تک محفوظ تھی۔ آزادی کی مقررہ حد کے باہر آتے ہی طاقتور عورت بھی کمزور بن جاتی ہے.... پھر میں ان عورتوں کی بات نہیں کر رہا ہوں جو ملازمت حاصل کرنے یا معاشی فائدے کے لیے اپنی عزت کو داؤ پر لگاتی ہیں۔ میں ان کی بات نہیں کر رہا ہوں جو جنسی آزادی کو ہائی سوسائٹی کا ایک حصہ مانتی ہیں۔ میں ان کی حمایت کر رہا ہوں۔ جو جھوٹی آزادی کے نام پر سب کچھ کھو کر کہیں کی نہیں رہ جاتیں..... یعنی عام عورت کا حمایتی ہوں.... آج عورت کی طرف نگاہ اٹھ کر احترام سے جھکتی نہیں ہے کیونکہ وہ خود مرد کو دعوت نظارہ دیتی ہے۔ پوسٹر ہوں، فلمیں، اشتہار ہوں یا بازار کی بے پناہ بھیڑ عورت فحاشی کا، عریانیت کا دوسرا نام بن گئی ہے جس کا خمیازہ ہر عورت کو بھگتنا پڑتا ہے۔"

سگریٹ کا چرکا لگنے سے انسپکٹر خان خیالوں کی دنیا سے باہر نکل آیا۔ اُس نے فوراً سگریٹ ایش ٹرے میں ڈال دی۔ ایش ٹرے سگریٹ کے ٹکڑوں سے بھر چکا تھا اس نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ صبح کے تین بج رہے تھے۔ مونا اب تک نہیں لوٹی تھی۔

ایک نیا سگریٹ سلگا کر اس نے سوچا: ابھی تک مونا سے متعلق جو ایسی ویسی باتیں وہ سوچ رہا ہے وہ بے بنیاد بھی تو ہو سکتی ہیں۔ انسان جس ماحول میں رہتا ہے کیا اس سے اتنا زیادہ متاثر ہو جاتا ہے کہ اس سے الگ ہٹ کر کچھ سوچتا ہی نہیں۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ مونا خیریت سے ہو۔ اس کے ساتھ وحشیانہ سلوک نہ ہوا ہو۔ وہ کسی رشتہ دار کے گھر چلی گئی ہو.... یا پھر کسی ایکسیڈنٹ کا شکار ہو کر اسپتال پہنچ

گئی ہو۔ آخر وہ کیوں اس کی تلاش میں نہیں جا رہا ہے؟ کیوں اپنے تھانے کے سپاہیوں کو مونا کی تلاش پر مامور نہیں کر رہا ہے۔

دوسرے ہی لمحے اس کا تھانیدارانہ ذہن کہتا: آج کل شہر میں غنڈہ گردی اتنی زیادہ بڑھ گئی ہے کہ مونا جیسی حسین عورت کا غنڈوں کے ہتھے چڑھ جانا بعید از قیاس نہیں۔ اگر واقعی مونا کے ساتھ یہی کچھ ہوا تو؟ ..... مونا کی کیا حالت ہو گی؛ کیا نازک مزاج مونا یہ ظلم، یہ ذلت سہہ سکے گی؟

کیا کرے .....؟ وہ کیا کرے؟.....

مونا کی تصویر سینے سے لگائے وہ بچوں کی طرح رو پڑا ..... اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ وہ بے تابانہ اٹھ کر دوڑا اور دروازہ کھول دیا۔

تباہ حال، لٹی پٹی مونا اس کی بانہوں میں جھول گئی۔

"جاوید، میں لٹ گئی جاوید!"

انسپکٹر خان نے پھرتی سے اسے اندر کھینچ کر دروازہ بند کر دیا۔ مونا کا برا حال تھا۔

"جاوید، انہوں نے مجھے لنکن کراسنگ سے اٹھا لیا تھا..... کچھ کرو جاوید — وہ کئی تھے..... انہوں نے مجھے کہیں کا نہ رکھا"، وہ صوفے پر ڈھیر ہو گئی۔

"پیاری مونا! میں جانتا ہوں کہ کیا ہوا ہے؟ میں سب سمجھ گیا ہوں۔ ساری کہانی جانتا ہوں۔ تم یہ بتاؤ کہ گھر کیسے لوٹیں؟ تمہیں کسی نے گھر لوٹتے ہوئے تو نہیں دیکھا؟" انسپکٹر خان نے اس کے پاس بیٹھ کر بے تابانہ سوال کرنے لگا۔

"جاوید!" مونا چیخی "تم جانتے تھے پھر بھی میری مدد کو نہ آئے؟ میں لٹتی رہی اور تم گھر میں بیٹھے بیٹھے میرے لوٹنے کا انتظار کرتے رہے بولو، تم میری مدد کو کیوں نہ آئے، کیوں نہ آئے تم؟"

"مونا.." انسپکٹر خان نے مونا کے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر پیار سے کہا "میں پوچھ رہا ہوں، تم یہاں کیسے آئیں؟ تمہیں اس حالت میں کسی نے دیکھا تو نہیں ہے؟ مونا، میں یہ اپنی اور تمہاری بہتری کے لیے پوچھ رہا ہوں۔"

مونا نے اپنے آپ کو اس کی گرفت سے چھڑا لیا۔ "انہوں نے مجھے ریلوے اسٹیشن کے پاس ڈال دیا تھا۔ لوکل سے آئی ہوں۔ سب کو اپنے کو چھپائی ہوئی آئی ہوں۔ کسی کو منہ

نہیں دکھایا۔ دکھاؤں گی بھی نہیں۔ اس قابل رہی ہی نہیں ہوں۔ روتے روتے وہ بے ہوش ہو گئی۔

جب مونا کو ہوش آیا تب دن کے گیارہ بج رہے تھے بہت دیر تک وہ خالی خالی نظروں سے چھت کو گھورتی رہی۔ یکایک درد کی ایک تیز لہر اس کے سارے بدن میں دوڑی اور اس کے ساتھ ہی رات کا بھیانک واقعہ اس کی آنکھوں میں گھوم گیا۔ ایک لمبی چیخ اس کے حلق سے نکلنے والی ہی تھی کہ انسپکٹر کی نرم میٹھی آواز نے اسے پکارا...
مونا.... مونا...

مونا نے سر گھما کر اپنے شوہر کو دیکھا وہ دھیرے سے بولا "اپنے دماغ پر زور نہ ڈالو۔ میں قیاس سے سب کچھ جان گیا ہوں۔ آخر پولس انسپکٹر ہوں۔ عصمت دری کے بیچاسوں کیس ڈیل کر چکا ہوں۔ تم جب رات گئے تک نہیں لوٹیں تو میں نے تمہاری گمشدگی کا ایک ہی سبب سمجھا اور نتائج پر غور کرنا شروع کر دیا تم اگر اپنی مرضی سے کہیں گئی ہوتیں تو فون پر مجھے اطلاع دے دیتیں۔ سنتی جاؤ درمیان نہ بولو۔ کسی کو کچھ پتہ نہیں ہے کہ تم پر کیا گزری ہے۔ تمہاری سہیلی کو میں نے مطمئن کر دیا ہے۔ ملازمہ کو تمہاری طبیعت خراب ہے.... کہہ کر کمرے میں نہیں آنے دیا۔ وہ کام کر کے جا چکی ہے میں اور تم گھر میں تنہا ہیں۔ جو کچھ ہوا اسے بھول جاؤ...."

"کیا کہہ رہے ہو؟ مونا بپھر اٹھی "تم نے اب تک رپورٹ کیوں نہیں لکھوائی"
کس کے خلاف رپورٹ لکھاؤں؟" انسپکٹر خان نے سنجیدہ ہو کر دیوار کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "کیا تم ان میں سے کسی کو پہچانتی ہو؟ شناخت پریڈ میں کسی ایک بھی شناخت کر سکتی ہو؟ اگر شناخت کرنے میں تم کامیاب ہو گئیں تو تمہیں یہ بھی قبول کرنا ہو گا کہ اس وقت تمہاری ذہنی حالت ایسی تھی کہ تم ان لوگوں کے چہرے یاد رکھ سکتیں اگر اس وقت تمہاری دماغی حالت درست تھی تو عصمت دری کا کیس نہ ہو گا۔ اس فعل میں تمہاری رضا مندی کا دخل سمجھا جائے گا۔ اسی لیے کہتا ہوں کہ بھول جاؤ اس حادثے کو....

"میرے ساتھ ظلم ہوا اور تم کہتے ہو کہ بھول جاؤں۔ تم مجرموں کو قانون کے حوالے نہ کرو گے؟ تم کوئی قدم چاہے نہ اٹھاؤ۔ میں انہیں پولس کے حوالے کروں گی.... سن رہے ہو؟ میں انہیں سزا دلاؤں گی۔ میں ان سے اپنی بے عزتی کا بدلہ لوں گی۔"

"مونا" انسپکٹر خان اس کے بال سہلاتے ہوئے بولا "کیا ظلم صرف تم پر ہوا ہے؟ بے عزتی کیا صرف تمہاری ہوئی ہے؟ شوہر اور بیوی کے درمیان جو ایک جذباتی تعلق ہوتا ہے اس تعلق سے میں نے بھی تمہارے ساتھ ذہنی عذاب برداشت کیا ہے تمہاری گمشدگی سے لے کر تمہاری واپسی تک کرب کے دریا میں ڈوبتا ابھرتا رہا ہوں. پھر بھی تو سوچو کہ اگر تم محفوظ ہو نہیں تو میرا یہ ذہنی کرب کس حساب میں جاتا؟ نہیں بے عزتی صرف تمہاری نہیں ہوئی ...... میری مردانگی کی بھی توہین ہوئی ہے. تمہاری حفاظت کی ذمہ داری میری ہے اپنے اس فرض کو نبھانے میں میں نااہل ثابت ہوا ہوں. اس لیے بے عزتی میری بھی ہوئی ہے. خیر چھوڑو، تمہاری صحیح سلامت واپسی میرے لیے سب کچھ ہے. بہتر یہی ہے کہ اس موضوع کو یہیں ختم کر دو."

"نہیں" مونا تڑپ کر کھڑی ہوگئی. "میں ابھی اسی وقت پولس اسٹیشن جاؤں گی. رپورٹ لکھا کر انصاف مانگوں گی. تم بزدل ہو. کیا اور شوہران حالات میں کھنفاتے نہیں جاتے؟"

"اور شوہر ایسی عورتوں کو اپنی زندگی سے نکال بھی تو دیتے ہیں" انسپکٹر خان نے یکایک سنجیدہ ہو کر کہا.

کیا؟" مونا کٹے پیڑ کی مانند بستر پر گر پڑی — "کیا ناکردہ گناہ کی سزا مجھے ہی ملے گی تم مجھے طلاق دے دو گے اور وہ ...... وہ جو مجھے بے عزت کر گئے. کھلم کھلا دندناتے پھر یں گے ...... کیوں کہ تم ان پر ہاتھ نہیں ڈالو گے ...... صرف مجھے اپنی زندگی سے دور کر کے مجھے سزا دے کر مطمئن ہو جاؤ گے ......" وہ رونے لگی.

"میں نے ایسا ہرگز نہیں کہا ہے مونا. میں تمہیں تصویر کے دوسرے رخ سے بھی واقف کرانا چاہتا ہوں. تم کہتی ہو کہ وہ ایک ویران مقام کا اندھیرا کمرہ تھا. ان کی ممکنہ تعداد بھی تمہیں نہیں معلوم ...... پھر ہم کس کے خلاف رپورٹ لکھائیں؟ تمہارے ساتھ رات کے چھ گھنٹوں میں جو کچھ ہوا وہ ایک بھیانک حادثہ تھا مگر یہ سمجھ لو کہ جس ذہنی اذیت سے تم اس درمیان گزریں وہ اس ذلت کا عشر عشیر بھی نہیں جس کا سامنا تمہیں بعد میں کرنا پڑے گا. ابھی تم اندھیرے بند کمرے میں چند کے ہاتھوں بے عزت ہوئی ہو اب انصاف کے نام پر تمہیں دن کے اجالے میں سیکڑوں کے سامنے بے عزت

ہونا پڑے گا۔ اس کا سلسلہ اس وقت شروع ہوگا جب تم تھانے میں رپورٹ لکھانے جاؤ گی۔ پولس کا وہ افسر جو تمہاری رپورٹ لکھے گا..... وہ سپاہی جو وہاں موجود ہوں گے وہ تمہاری رپورٹ کے ہر جملے کے ساتھ تمہارے جسم کے نشیب و فراز پر نگاہیں جمائیں گے۔ تم اپنے آپ کو ان کی گندی نگاہوں کے مقابل برہنہ محسوس کرو گی۔ وہ آنکھوں آنکھوں میں تمہاری عصمت لوٹیں گے۔ پھر تمہیں ڈاکٹری معائنے کے لیے اسپتال بھیجا جائے گا۔ وہاں اسپتال کا عملہ تمہیں دیکھنے کے لیے جمع ہو جائے گا۔ سب ایک دوسرے کو تمہارے بارے میں بتائیں گے۔ تم نظریں چراؤ گی اور وہ تمہارے وجود میں نظریں پیوست کر دیں گے۔ تمہیں اپنے جسم پر آنکھیں ہی آنکھیں چپکی نظر آئیں گی۔ ہوس بھری نگاہیں تم نہ برداشت کر سکو گی۔ پھر اخباروں میں خبر آئے گی۔ رشتے، ناطے والے، شناسا، پاس پڑوس کا ہر شخص تم سے بار بار اس کا ذکر کرے گا..... "خدا کے لیے بس کرو مونا اپنے کان بند کر لیے۔ "تمہیں سننا پڑے گا۔" انسپکٹر خان نے زبردستی کانوں پر سے اس کے ہاتھ ہٹا دیے۔ "پھر تم عدالت جاؤ گی۔ عدالت میں موجود بھیڑ کا دھیان تمہارے بیان پر نہیں تمہارے جسم پر ہوگا۔ وہ تم پر گندے فقرے اچھالے گی۔ وکیل تم سے ایسے شرمناک اور بے ہودہ سوال پوچھے گا کہ تم چاہو گی زمین پھٹ جائے اور تم اس میں سما جاؤ۔ تمہیں اس اندھیرے بند کمرے میں ہونے والے حادثے کے ایک ایک لمحے کا حساب دینا ہوگا۔ ایک ایک پل کا بیان کرنا ہوگا صرف یہ کہنے سے کام نہ چلے گا کہ تمہاری اجتماعی عصمت دری ہوئی۔

"میں مر جاؤں گی..... مونا سسکنے لگی "میں اس سے پہلے مر جاؤں گی۔"

"خودکشی مسئلے کا حل نہیں مونا۔ تمہاری زندگی سے میں بھی وابستہ ہوں۔ یاد رکھو ایک مرد کے لیے ایک شوہر کے لیے، اس سے زیادہ توہین آمیز اور کوئی بات نہیں ہو سکتی کہ وہ اپنی بیوی کی حفاظت میں ناکام رہے۔ تم اگر اپنی زندگی کا خاتمہ کر لو گی تو میرا ضمیر ہمیشہ مجھے لعنت و ملامت کرتا رہے گا اسی لیے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ ہم اس حادثے کو ایک بھیانک خواب سمجھ کر بھول جائیں۔

"مگر کیا یہ ممکن ہو گا۔ میں یہ سب بھول سکوں گی؟"

"تمہیں بھولنا ہوگا۔ میں اپنا ٹرانسفر کرا لوں گا۔ ہم اس شہر سے چلے جائیں گے اور یہاں کی بات یہیں چھوڑ جائیں گے۔ میں قسم کھاتا ہوں کہ دوبارہ اس حادثے کو یاد نہیں کروں گا۔ تم بھی قسم کھاؤ ہماری محبت سچی ہے تو ناکردہ گناہ کا ایک گھونٹ زہر ہماری پوری زندگی کو زہر آلود نہیں کر سکتا مونا..... کبھی نہیں کر سکتا۔"

پاپا کا پہلا خط ملا تھا تب ہی سے
برج موہن کچھ کچھ پگھلنے لگا تھا۔ وہ اپنی کوتاہی
ریلائیز کرتے لگ رہے تھے۔ ورنہ پاپا
اور انکساری! ناممکن! اپنے خریدے ہوئے
داماد سے عاجزی سے بات کرنا ان کی شان
کے خلاف تھا۔ وہ تو حکم دینے اور حکم کی تعمیل
ہوتے دیکھنے کے عادی تھے۔

برج موہن نے لفافہ چاک کر کے
خط پڑھا اور سمجھ لیا کہ یہ فقط تمہید ہے۔ دوسرا
خط سیدھے سیدھے گھر لوٹ آنے کے اصرار
سے پُر ہو گا۔ اور واقعی ایسا ہوا بھی۔
ان دو برسوں میں وہ پاپا کی نس نس پہچان
گیا ہے۔ اپنی غرض کی تکمیل کے لیے وہ کیسے
داؤں پیچ کھیل سکتے ہیں، کتنا نیچے گر سکتے ہیں
یہ سب وہ نہ صرف دیکھ چکا ہے بلکہ جھیل
چکا ہے۔

اپنے پہلے خط میں بے حد محتاط رہ
کر انھوں نے لکھا تھا۔ "بیٹے ان دس مہینوں
میں ہم سب نے تمہیں بہت مس کیا ہے۔ ہم
نے یعنی میں نے، نیہا کی ممی نے، پنکی نے
اور آف کورس خود نیہا نے۔ کیا تمہیں کبھی ہم لوگوں
کی یاد آئی؟ پنکی تو ہر دم اپنے ڈیڈی کو یاد کرتی
رہتی ہے۔"

"اپنے ڈیڈی.....، یہ الفاظ برج
موہن کو چوٹ پہنچا گئے۔ کیا خفیفت میں وہ پنکی

کا ڈیڈی ہے ؟ کیوں یہ تخاطب اسے گالی جیسا لگتا ہے ؟ اسے جانے انجانے تکلیف پہنچاتا رہتا ہے ۔ عجیب بات تھی کہ اس گھر میں سب سے زیادہ غصہ اسے معصوم پنکی ہی پر آتا تھا۔ نہ اس دنیا میں اپنا وجود قائم کرنے کے لیے کمر کس کر تیار ہوتی نہ برج موہن کو اس کی آمد کا پروانہ دینے کے لیے وسیلہ بنایا جاتا۔ اس کے ساتھ ہوئے فریب کا جیتا جاگتا ثبوت تھی پنکی .... مگر اسے پنکی سے لگاؤ بھی بہت تھا۔ گلابی رنگت والی گول مٹول سی پنکی جب کلکاری مار کر اس کی طرف ہاتھ بڑھاتی تو وہ بھول جاتا کہ پنکی اس کی بیٹی نہیں ہے ۔ وہ اسے گود میں لے کر بے تحاشا پیار کرتا۔ اس کے ساتھ کھیلتا۔ وہ نظروں کے سامنے نہ ہوتی تو پرانی باتیں یاد آ کر اسے پنکی سے برگشتہ کر دیتیں۔

برج موہن سوچتا کہ جیسے خود اس کے پیدا ہونے پھر یتیم ہو جانے اور در بدر مارے مارے پھرنے میں اس کی اپنی خواہش کو کوئی دخل نہیں تھا اسی طرح پنکی بھی اپنی تقدیر کے لکھے کا شکار ہوئی ہے۔ پنکی کو اگر اپنی ماں کے انتخاب کا اختیار ہوتا تو کم از کم نیہا کی کوکھ سے جنم لینا وہ ہرگز پسند نہ کرتی۔ ابھی وہ ناسمجھ ہے۔ جب بڑی ہوگی تو اور لوگوں کے طعن و تشنیع کا اسے سامنا کرنا پڑے گا تب بڑے دکھ اٹھائے گی وہ۔ یہی جب چھوٹا تھا تب سب فکروں سے آزاد تھا۔ اب دنیا بھر کی فکریں گھیرے رہتی ہیں۔ کہنے کو شہر بھر میں مشہور سسرال ہے۔ پاپا ممی جیسے روشن خیال ساس سسر ہیں۔ نیہا جیسی کلچرڈ، تعلیم یافتہ خوبصورت بیوی ہے۔ پنکی جیسی پھول سی بیٹی ہے۔۔ پھر بھی کہیں کچھ ہے جو اسے غیر مطمئن رکھتا ہے۔ چین سے جینے نہیں دیتا۔

درحقیقت نیہا کے پاپا کی لکھاوٹ میں جب یہ رجسٹری خط اسے ملا تھا تب برج موہن نے ہرگز یہ نہیں سوچا تھا کہ پاپا ایسا پرشفقت رویہ اختیار کریں گے۔ اس نے سوچا تھا کہ طلاق کے کاغذات ہوں گے یا بات ابھی قابل برداشت حد میں ہوگی تو دھمکی بھری ہوگی کہ سیدھے سیدھے گھر لوٹ آؤ ورنہ وہیں پھینک دیے جاؤ گے جہاں سے اٹھا کر لائے گئے تھے۔ اس ذلت آمیز دھمکی کے تصور ہی سے اس کے منھ میں کڑواہٹ گھل گئی تھی اچھا ہے جو وہ لوگ اسے خود آزاد کر دیں۔ وہ کسی سیدھی سادی لڑکی سے شادی کر کے نئے سرے سے زندگی کا آغاز کرے گا۔ لیکن لفافے میں سے پنکی کی مختلف پوز کی تین تصاویر برآمد ہوئیں اور ممی پاپا کی میٹھی جھڑکی۔ برج موہن

بنکی کے فوٹو دیکھتا اور سوچتا رہا کہ بنکی کے فوٹو بھیج کر پاپا کیا جتلانا چاہتے ہیں؟ ہٹ دھرمی اور بے شرمی کی انتہا ہے یہ۔ اپنی آنکھ کا شہتیر انہیں نظر نہیں آتا۔ دوسروں کی آنکھ کا تنکا ڈھونڈنے چلے ہیں۔ اپنی بیٹی کی آوارہ گردی پر مہمیز نہیں لگا سکتے، جو لگانے کی کوشش کرتا ہے اسے اپنے کام سے غرض رکھنے کی نصیحت کرتے ہیں .... اسے اس کے ماضی کی یاد دلاکر ذلیل کرتے ہیں ... احسان جتاتے ہیں کہ ان ہی کا ظرف تھا جو گلی کی اینٹ چوبارے میں لگائی۔

گذشتہ دس مہینوں سے وہ طلاق کے کاغذات کا منتظر تھا۔ وجہ بھی تھی اس کی نیہا ذرا ذرا سی بات پر کہہ اٹھتی تھی۔۔ "یو فول، میں طلاق دے دوں گی۔"

یہ وہی نیہا تھی جو شادی کے بعد راجہ بیٹا کرکر اس پر واری نیاری جاتی تھی۔ بنکی کی پیدائش تک اس نے برج موہن کو اپنی اداؤں سے کچھ ایسا گرویدہ بنالیا تھا کہ وہ سب تلخیاں بھلا بیٹھا۔ ویسے بھی نیہا کی پہلی غلطی تھی یہ۔ لڑکی جوان ہو، حسین ہو، اس پر پابندیاں نہ ہوں۔ گھر میں کوئی ضابطۂ اخلاق نہ ہو تو پاؤں بہکنے میں دیر نہیں لگتی۔ برج موہن، نیہا کو پوری طرح سمجھ بھی تو نہیں پایا تھا۔ نیہا اتنی معصوم نہ تھی جتنی وہ سمجھ بیٹھا تھا۔ پاپا نے جس طرح برج موہن کو دریافت کیا تھا وہ بس ان ہی کے بس کی بات تھی۔ حالات نے کچھ ایسا نازک موڑ اختیار کرلیا تھا کہ نیہا کے پھیرے کرا لینے ضروری ہو گئے تھے۔ نیہا مغربی تہذیب کی پروردہ اور دلدادہ تھی۔ اس سے پہلے بھی اس موڑ تک پہنچی تھی مگر صاف دامن بچالے گئی تھی ... مگر نسوانی فطرت کے عین مطابق اس نے ایک بار داؤ کھیل کر بازی جیتنے کا تہیہ کرلیا۔ وہ ماں بننا چاہتی تھی بن بیاہی ماں ... کیونکہ وہ کسی مرد کی برتری زندگی بھر کے لیے قبول کرنے کو تیار نہ تھی۔ مگر یہاں ممی پاپا کا سوشل اسٹیٹس آڑے آگیا۔ انہوں نے دنیا کو دکھانے کے لیے نیہا کی شادی کرنا ضروری سمجھا۔

نیہا کے درجن بھر بوائے فرینڈس تھے مگر ان میں سے کسی ایک کو بحیثیت شوہر منتخب کرکے وہ دوسروں کو ناراض نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس لیے قرعۂ فال نکلا۔ کسی اجنبی شخص کے نام۔

پاپا کی سریندر نگر والی فیکٹری میں برج موہن سپروائزر تھا۔ خوش شکل اور

خوش مزاج یہ نوجوان پاپا کی آنکھوں میں چڑھ گیا۔ اس کا ننیم ہونا سونے پر سہاگہ ثابت ہوا۔ پاپا نے چارہ پھینکا۔ ہمدردی جتائی، ہمت افزائی کی۔ عہدے میں ترقی دی۔ برج موہن کا سر پاپا کے احسانوں تلے دبتا چلا گیا۔ پاپا نے جب اسے اپنی دامادی کی سعادت بخشنے کا اعلان کیا تو اس کا سر بالکل ہی جھک گیا اسی لیے تو وہ پاپا کی آنکھوں میں خودغرضی اور مکاری کے سایے نہ دیکھ سکا۔

کئی دنوں تک قسمت کی اس کروٹ سے برج موہن بھونچکا رہا۔ پاپا ممی کی عنایات اور نیہا کا پیار اسے کچھ سوچنے سمجھنے ہی نہیں دیتا تھا۔ مگر کب تک؟ ایک روز حقیقت ظاہر ہو گئی اور وہ پھر بھونچکا رہ گیا۔ کیا کسی کی سادہ لوحی کا یوں بھی فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے؟ یوں بھی کسی کو فریب دیا جا سکتا ہے؟

حقیقت سے واقف ہونے پر اس کے لیے وہاں رکنا محال ہو گیا تھا مگر نیہا اس کے آگے گڑگڑائی تھی۔ روئی تھی۔ مستقبل میں اس کی وفادار رہنے کی قسمیں کھائی تھیں برج موہن جو شاید فریب کھانے کے لیے ہی پیدا ہوا تھا۔ اس بار بھی اپنی سادہ لوحی سے نیہا کا اعتبار کر گیا تھا۔

نیہا اگر اپنے وعدے پر قائم رہتی تو برج موہن نبھائے جاتا اسے، مگر پنکی کی پیدائش کے بعد تو سارا عالم ہی بدل گیا۔ پاپا ممی کی آنکھوں میں شفقت کی جگہ بے اعتنائی جھلکنے لگی۔ نیہا بے رخی برتنے لگی۔ وہ غیر اہم اور غیر ضروری فرد بن کر رہ گیا۔

نیہا جس زندگی کی عادی ہو چکی تھی اس زندگی سے اسے برج موہن کے مضبوط ہاتھ کھینچ کر الگ کر سکے نہ پنکی کی ننھی ننھی باہیں اسے واپس بلا سکیں۔ وہ پھر پرانی ڈگر کی راہی بن گئی۔ دوستوں کے ساتھ سیر و تفریح اور کلبوں پارٹیوں کے ہنگاموں میں ڈوب گئی۔ برج موہن اس کے دوستوں کو دیکھتا اور دل ہی دل میں پنکی کے نقوش ان سے ملانے لگتا۔ کامیاب نہ ہوتا تو جھنجھلا جاتا۔ کسی کی رنگت پنکی سے ملتی تو کسی آنکھیں۔ کسی کی ناک کی اٹھان جیسی پنکی کی ناک لگتی تو کسی کی مسکراہٹ دیکھ کر اسے محسوس ہوتا کہ پنکی بھی تو ایسے ہی مسکراتی ہے۔

گھر چھوڑ جانے کا فیصلہ برج موہن نے اچانک ہی نہیں کیا تھا۔ اس سمت میں بہت

دنوں سے سوچ رہا تھا۔ نیہا کا اسے بغیر بتائے دوستوں کے ساتھ آؤٹنگ چلا جانا فوری سبب بن گیا۔ ماں بیٹی تو بڑا ہی ... پاپا بھی خوب گرجے برسے تھے۔ "دفع ہو جاؤ ہماری بیٹی تم سے طلاق لے لی گی۔ تم سے بہتر کسی نوجوان سے ہم اس کی شادی کر دیں گے۔"

ایک سوٹ کیس لے کر برج موہن نے گھر چھوڑ دیا تھا۔

سات مہینے بعد پاپا کا پہلا خط ملا تو برج موہن کچھ کچھ پگھلنے لگا۔ دوسرا خط نیہا کا آیا۔۔۔ لوٹ آنے کی گذارش کی تھی نیہا نے۔ اسی خط میں ممی نے بھی دو سطور میں لوٹ آنے کا اصرار کیا تھا۔ پاپا بیک گراؤنڈ تیار کر چکے تھے۔ برج موہن لوٹنے کے لیے لگ بھگ آمادہ ہو چکا تھا کہ پاپا کار لے کر آ گئے۔

پنکی اسے دیکھتے ہی دوڑ کر گود میں چڑھ گئی،۔۔۔ وہ بار بار اس سے پوچھتی تھی ــــ "ڈیڈی، آپ کہاں چلے گئے تھے؟"

کسی طرح پنکی کو بہلا کر وہ نیہا کے کمرے کی طرف بڑھا۔ دروازے میں قدم رکھتے ہی ٹھٹک کر رہ گیا۔

برج موہن کا شمار کل تک ان لوگوں میں ہوتا تھا جو کہتے ہیں کہ نام میں کیا رکھا ہے آنکھ کے اندھے نام نین سکھ۔ امیر چند، فقیر چند، خوسحال سنگھ ہوں یا ڈکر مارے، بڑے شخص وہی ہوتا ہے جوان مضحکہ خیز ناموں کے نہ ہونے پر بھی ہوتا۔ شخصیت کو بنانے بگاڑنے میں نام کوئی رول ادا نہیں کرتا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ سماجی شعور بیدار ہونے کے بعد انسان کو اپنے لئے موزوں نام اختیار کرنے کی آزادی ملے تو وہ یقیناً ہی اپنی شخصیت سے میل کھانے والا نام پسند کرے گا۔ بزدلی آدمی شیر خاں یا بہادر سنگھ، بھینگی آنکھوں والی سینا اور فربہ شخص باریک راؤ نام ہرگز پسند نہ کرے گا۔

یتیم خانے میں برج موہن کو ننکر نام سے پکارا جاتا تھا۔۔۔ ایک بوڑھی آیا اسے پانڈورنگ کہہ کر لاڈ جتاتی۔ ماں پتا نمبر ۲ یعنی جنہوں نے اسے یتیم خانے سے گود لیا تھا، اس کا نام گوپال رکھا۔ اس کی ماں نمبر ۲ کہا کرتی کہ جیسے دیوکی کا بیٹا کرشن یشودھا کی گود میں پلا بڑھا ویسے ہی یہ گوپال کرشن اس کی سونی گود کو آباد کرنے آیا ہے۔

گوپال کرشن کا نام مل جانے سے اس جیسا نصیب نہیں ملا کرتا اسی لیے تو ماں نمبر ۲ کی کوکھ سے ان کے اپنے بیٹے کے جنم لیتے ہی گوپال کرشن دودھ کی مکھی کی طرح نکال پھینکا گیا۔ منتی بیٹے سے ملازم بنا دیا گیا۔۔۔ وہ بھاگ نکلا اس گھر کو چھوڑ کر۔ برج موہن

نام اختیار کیا۔ مزدوری کر کے پڑھائی کی اور سپروائزر لگ گیا۔ پتا جی۔ زمین دار تھے۔ کھیتوں کے معائنے پر جاتے تو اکثر برج موہن کو ساتھ لے جاتے۔ کھیت میں ہر وقت ایک آدمی بے حس و حرکت کھڑا دیکھ کر ایک مرتبہ برج موہن نے پوچھا تھا۔ "یہ آدمی دن رات ایسے ہی کھڑا رہتا ہے؟ اسے بھوک پیاس نہیں لگتی؟ اسے کسی چیز کی ضرورت نہیں پیش آتی؟" "وہ سچ مچ کا آدمی نہیں ہے بیٹے۔ لکڑی اور مٹی کی ہانڈی سے بنائے گئے پتلے کو کپڑے پہنا دئے گئے ہیں..."

"مگر کیوں بنایا ہے پتا جی! اس سے کیا فائدہ ہوتا ہے؟" برج موہن نے طفلانہ معصومیت سے پوچھا تھا۔

"بیٹے فصل جب پک کر تیار ہو جاتی ہے تو اس کی حفاظت کے لیے یہ نقلی پہریدار کیا جاتا ہے اسے بجو کا کہتے ہیں؟"

"راجہ.... میرے راجہ! آ گئے تم! رک کیوں گئے؟ اندر آؤ نا!" تہمانے پیار بھرے لہجے میں پکارا۔

برج موہن ہنس پڑا۔ زور زور سے قہقہے لگانے لگا۔ پاپا ممی دوڑے آئے ۔
"برج! برج موہن ہوش میں آؤ۔ کیوں ہنس رہے ہو؟" کسی اندیشے سے زرد پڑ کر پاپا اُسے جھنجھوڑنے لگے۔

"برج! کون برج؟" برج موہن تن کے کھڑا ہو گیا۔ ڈرامائی انداز میں سینے پر ہاتھ رکھ کر کچھ جھکا پھر سیدھا کھڑا ہو کر بولا۔ "میں قبول کرتا ہوں کہ میرا نام بجو کا ہے۔ بجو کا رائے تہمارائے کا پتی۔ میں یہ بھی قبول کرتا ہوں کہ پنکی میری بیٹی ہے اور تہمارائے کی گود میں پلتا شیر خوار بچہ بھی میرا ہی ہے۔ میں اپنے پورے ہوش و حواس میں یہ بیان دے رہا ہوں کہ میں بجو کا ہوں..... بجو کا رائے۔

پورا کمپارٹمنٹ کانفرنس سے لوٹنے والوں نے گھیر رکھا ہے۔ بھانت بھانت کی بولیاں سنائی دے رہی ہیں۔ ان میں اتر پردیش کے بھتے شامل ہیں تو بنگالی موشائے بھی کچھ کم تعداد میں نہیں ہیں۔ جنوب کے سوامی ریڈی ہیں تو گجرات اور مہاراشٹر کے پٹیل اور پاٹل بھی ہیں۔

ہر ایک کا اپنا گروپ ہے کوشش یہی ہے کہ اپنے گروپ کے سب اشخاص کو ایک ساتھ جگہ ملے۔ ریزرویشن میں اگر یہ سہولت حاصل نہیں ہوئی ہے تو ایک دوسرے سے درخواست کر کے جگہ بدلی جا رہی ہے۔ من چاہی سیٹ مل جانے پر اطمینان کی سانس لی جا رہی ہے۔

کچھ ایسے بھی ہیں جن کا کوئی گروپ نہیں ہے۔ ان کو جہاں جگہ ملی ہے وہیں بیٹھ کر خاموشی سے دوسروں کی حرکات و سکنات کا مشاہدہ کر رہے ہیں۔ بظاہر کسی رسالے اور اخبار کو ہاتھ میں لے کر مطالعے میں منہمک ہونے کا بہانہ کر کے بغور دوسروں کی گفتگو سن رہے ہیں۔

اپنے اپنے گروپ میں اپنی اپنی علاقائی زبان بولی جا رہی ہے لیکن بحث کا موضوع سب کا ایک ہے۔ ذکر وہاں کا ہو رہا ہے جہاں سے ہو کر آئے ہیں۔ ہم ہندوستانیوں کے

مزاج کی یہ خاصیت ہے ..... بیٹھ پیچھے برائی کرنے کی، ہر کام میں مین میخ نکالنے کی۔ کسی کے محاسن گنوانے ہوں تو بخیلی کی انتہا کر دیں گے۔ ایک ایک لفظ یوں ناپ تول کر بولیں گے جیسے ذخیرۂ الفاظ کے ختم ہونے کا خوف ہو مگر کسی کی غیبت کرنی ہو، کسی کے کام میں عیب نکالنے ہوں تو اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا ہر ایک اپنا فرضِ اوّلین سمجھے گا، پوری دلجمعی سے بولے گا۔ اپنے ذخیرۂ الفاظ کی وسعت کا تعارف کرائے گا — وہ جو کہتے ہیں ناکہ چوری کا گر میٹھا ہوتا ہے وہی بات۔ منھ پر سچ کہا نہیں جاسکتا کہ سچ کڑوا ہوتا ہے۔ پھر بیٹھ پیچھے ایک کی چار بنانے میں جو لطف ہے وہ کھری کھری کہنے میں کہاں ہے؟

چار اشخاص مدعو ہوں یا چار ہزار، میزبان کی کوشش یہی ہوتی ہے کہ مہمانوں کی خاطر داری میں کوئی کمی نہ رہ جائے۔ کسی بات پر وہ کبیدہ خاطر نہ ہوں۔ کسی معاملے میں انہیں خجالت کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ مہمانوں کو خدا کی نشان مان کر ان کا انتظار کرنے والوں کا دلیش ہے یہ۔

ملک کے مختلف حصوں سے آنے والے مختلف مزاج والوں کو مطمئن کر پانا گوور دھن پہاڑ انگلی پر اٹھانے جیسا مشکل کام ہے۔ کیُوں نے تو وہیں طنز کرنا شروع کر دیا تھا۔ ہمارے ساؤتھ میں آؤ، ہمارے بنگال میں آؤ تو دکھائیں حسن انتظام کسے کہتے ہیں۔ خیر مقدم اور آؤ بھگت کیسے کی جاتی ہے ..... یہاں تو کسی بات کا ٹھکانہ نہیں۔ ہر بات میں بدنظمی اور ہر جگہ بدانتظامی، جو کھانا ہم نے کبھی کھایا نہیں وہ کیوں کر کھائیں؟ کچھ تو ہماری طرف کے پکوان ہوتے۔ پھر کون سا اپنی جیب سے کھلا رہے ہیں۔

ویسے دیکھا جائے تو اپنے علاقے کے پکوانوں کی مانگ کرنا سراسر غلط تھا۔ ہٹ دھرمی تھی۔ یہ کسی طرح ممکن نہ تھا۔ اس غلط مطالبہ کے کرنے والوں میں ایک علاقہ تو پہلے ہی بدنام ہے۔ یہ کمرۂ طعام میں پہلے پہنچ جائیں تو بعد والوں کے لیے کچھ نہیں بچتا جسے بعد میں بدنظمی کا نام دے دیا جاتا ہے۔ میزبانوں کو لعن طعن سننا پڑتا ہے الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے۔

اچھے برے لوگ ہر مقام پر ہوتے ہیں۔ شرافت کسی ایک مذہب یا علاقے والوں کی ملکیت نہیں ہے نہ ہی رذالت کسی خاص فرقے یا طبقے کی قسمت۔ انسان کی شناخت اس کے عمل سے ہوتی ہے وہی اس کی قسمت بناتی یا بگاڑتی ہے۔ پوت کے پاؤں پالنے

ہیں نظر آتے ہیں۔

کانفرنس کا یہ اکیسواں اجلاس تھا۔ ہر علاقہ ایک ایک بار میزبانی کے فرائض نبھا چکا تھا مگر اپنے یہاں کا کاج نپٹا نہیں کہ دوسروں کے کام پر تنقید کرنے کو کمر کس کر تیار ہو جاتے ہیں۔ جو کچھ تنقیدیں ان پر ہوئی تھی اسے مع سود واپس کرتے ہیں۔

دیپا کا شمار ہمیشہ سے کم سخنوں میں ہوتا ہے پھر یہاں تو وہ خود کو بہت تنہا محسوس کر رہی تھی۔ ملک کے اس خوبصورت ترین علاقے میں منعقدہ کانفرنس اٹنڈ کرنے میں اس کے سیاحت کے شوق کو بڑا دخل تھا۔ پہلے دن کے تینوں اجلاس اٹنڈ کیے تھے اس نے اور پھر کل کل کرتے جھرنوں اور برف سے ڈھکی پہاڑیوں کی سیر کرنے نکل کھڑی ہوئی تھی اس لیے کانفرنس میں آئے مندوبین سے راہ رسم بڑھانے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔ ٹرین میں آتے وقت ایک جوڑے سے ملاقات ہوئی تھی جو خالص سیر و تفریح کی غرض سے آیا تھا۔ دونوں دن ان ہی کے ساتھ گھومی پھری تھی دیپا . . . . وہ آٹھ روز قیام کرنے والے تھے اس لیے واپسی کے سفر میں دیپا تنہا رہ گئی تھی۔

نوے فیصد مندوبین کا کانفرنس میں آنے کا مقصد سیر سپاٹا ہی تھا جسے کانفرنس جاری رہنے تک کنواری کے پیٹ کی طرح چھپائے رہے تھے وہ۔ اب واپسی میں کسی کو ببانگ دہل اعلان کرنے میں تامل نہیں ہو رہا تھا کہ پہلگام زیادہ خوبصورت مقام ہے گلمرگ سون مرگ . . . . یا کہ ڈل جھیل میں شکارے کی سیر کا جو لطف ہے وہ نشاط شالیمار کی سیر میں ہرگز نہیں ہے۔

دیپا کے چہرے کے خط و خال سے یہ قیاس کرنا مشکل ہے کہ وہ ہندوستان کے کس علاقے سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کی سرخ سفید رنگت دیکھ کر مہاراشٹر بن اسے کوکونستھ براہمن سمجھ لیتے ہیں، چہرے کی بیضوی ساخت اسے سندھی ظاہر کرتی ہے تو صحت مند اور سرو قد جسم اس کے پنجاب سے متعلق ہونے کا اشارہ دیتا ہے . . . . جب کے اس کا سر نیم اسے بنگالی اور گجراتی ہونے کا فائدہ پہنچاتا ہے۔ مختصراً یہ کہ جب تک دیپا خود اپنا تعارف نہ کرائے وہ کسی بھی اس فرقے کی لگ سکتی ہے جس کی وہ ہے نہیں۔ بہ اتفاق اسے کبھی کبھی بڑا فائدہ پہنچتا ہے۔

جیسے ابھی کی بات لے لیجئے۔ کمپارٹمنٹ میں آس پاس بیٹھے ہوئے مسافروں

کو ذرا بھی گمان ہوتا کہ ان کی یہ ہم سفر اسی قوم کی ہے جس پر وہ نکتہ چینی کر رہے ہیں۔ تو وہ محتاط ہو کر بولتے۔ بے سبب اور ناجائز الزام تراشی نہ کرتے۔

"آپ کہاں سے تعلق رکھتی ہیں؟" دیبا کے نزدیک بیٹھے ہوئے ایک نوجوان نے اس سے دریافت کیا۔ وہ شاید بہت دیر سے نوٹ کر رہا تھا کہ دیبا کمپارٹمنٹ میں ہو رہی گفتگو پر بظاہر توجہ نہ دے کر بھی پوری طرح متوجہ ہے۔

دیبا کو اس نوجوان کے ہندی تخاطب پر حیرت ہوئی۔ ابھی ایک ہم سفر کو ایک جنوبی ہند کے باشندے سے ہندی میں خطاب کرنے پر "ناک ان انگلش" روکھا جواب پاکر شرمندہ ہوتے دیکھ چکی تھی۔

جنوبی ہند میں چلنے والی ریلوں میں جو زبان بولی جاتی ہے اسے سن کر کوئی اندازہ لگانا چاہئے کہ یہ کس دیش کے باسی ہیں تو کامیاب نہ ہوگا۔۔۔ اپنی علاقائی زبان بولتے ہیں یا غیر ملکیوں کی بلکہ حکمرانوں کی زبان بولتے ہیں۔ اپنے ملک کی یا۔۔۔ اپنی قومی زبان نہیں بولتے۔ یہ تو شمالی ہندوستان کی ریل تھی اور ملک کے ہر کونے سے آئے ڈیلی گیٹس اس میں سفر کر رہے تھے پھر بھی ہندی اردو کی بجائے انگریزی رابطے کی زبان بنی ہوئی تھی۔ جو اپنے ملک میں عزت نہ پائے اسے غیر ملک میں کون سر چڑھائے "میڈم، کیا آپ بات کرنے کے موڈ میں نہیں ہیں؟" اس مرتبہ نوجوان نے اپنا سوال انگریزی میں دہرایا۔

دیبا چونک پڑی۔ مسکرا کر ہندی میں اس سے بات کرنے لگی۔ وہ بڑا خوش مزاج نوجوان ثابت ہوا۔ آسنسول کے ایک کالج میں لکچرر تھا۔۔۔ نام تھا تنشاو مکھرجی۔

"میں دیبا شاہ ہوں۔ مہاراشٹر سے آئی ہوں"

"آپ گجراتی ہیں؟" تنشاو نے پوچھا۔ تنشاو بنگال کا تھا اس لیے دیبا کو بنگالی سمجھنے کی غلطی نہیں کر سکتا تھا۔ شاہ بنگالی میں شا یا ساہا ہو جاتا ہے۔ دوسرے البتہ یہ غلطی کر سکتے تھے۔

"نہیں" دیبا نے ہنس کر کہا "شیر شاہ، واجد علی شاہ اور نصیر الدین شاہ کی قطار میں کھڑی میں دیبا شاہ ہوں"

"اوہ !" تنشاو کچھ شرمندہ سا ہو گیا۔ تھوڑی دیر پہلے تک وہ بھی کمپارٹمنٹ میں چل رہے برائی پُران میں حصّہ لے رہا تھا۔ بات کانفرنس میں ڈیلی گیٹس کے قیام وطعام کی بدنظمی اور بدانتظامی کی حدود پھلانگ کر وہاں کے لوگوں کی نجی زندگی تک پہنچ گئی تھی۔ پڑوسی ملک کے بیلسان کے دلوں کے نرم گوشوں کو لے کر سازش کی بو سونگھی جا رہی تھی۔ ملک میں دن بدن بڑھتی دہشت وادی سرگرمیوں میں اُن کی شمولیت اور پیش قدمی پر رائے زنی کی جا رہی تھی۔ ان کی وفاداری اور حب الوطنی پر سوالیہ نشان لگائے جا رہے تھے۔

تنشاو کو خجل ہوتا دیکھ دیپا کو حیرت ہوئی۔ عام طور پر اس طرح کے حالات میں لوگ موضوع بدل دیتے ہیں.... وہ بے چارے بھی کیا کریں جو ہدف ملامت بنتے ہیں۔ ایک مخصوص قوم سے تعلق رکھنے کی بنا پر ان کی حب الوطنی ہمیشہ مشکوک رہی ہے اور رہے گی۔ یوں تو ملک کے لیے وہ بھی سر سے کفن باندھتے ہیں.... مگر ان کی وفاداری پر لگا ہوا سوالیہ نشان بڑا ہی ہوتا جاتا ہے۔ اگنی پریکشا کے بعد بھی سیتا کی پاک دامنی پر شک کرنے والوں کا دیش ہے یہ۔ دلوں میں جھانک کر کون دیکھتا ہے؟ دیش بھگتی کا نعرہ لگانے والے فرقہ وارانہ جذبات کی آگ بھڑکا کر دیش کے اتحاد و اتفاق کی جڑیں کس طرح کھوکھلی کر رہے ہیں یہ سب پر عیاں ہے.... پھر بھی ان پر کوئی انگلی نہیں اٹھاتا.... وہ حب الوطن ہیں کیونکہ اس ایک مخصوص قوم کے نہیں ہیں۔

"تنشاو صاحب! آپ نے یہ خاموشی کیوں اختیار کر لی؟ کیا میرا نام کسی مجرم کا بنتہ دیتا ہے؟ یا میرا نام نا ہوا بم ہوا کہ جس کے پھٹنے کے ڈر سے آپ کو سانپ سونگھ گیا؟" دیپا نے ماحول کی سنجیدگی کو ختم کرنے کے لیے ہلکا پھلکا مذاق کیا۔

نہیں مس دیپا، ایسی کوئی بات نہیں۔" تنشاو نے اپنائیت سے اس کا نام لیتے ہوئے کہا، "اگر انجانے میں مجھ سے دل کو چوٹ لگنے والی بات ہوئی ہو تو مجھے معاف کر دیں۔ حقیقت میں بھی مجھے.... میرا مطلب ہے میرے علاقے والوں کو کوئی اس طرح تنقید کا نشانہ بنائے تو میں برداشت نہ کر سکوں گا۔"

"اگر برداشت نہ کر سکے تو کیا کریں گے؟" دیپا نے یکا یک سنجیدہ ہو کر پوچھا۔

"اختلاف کروں گا۔ احتجاج کروں گا"

"یہ سمجھتے ہوئے بھی کہ آپ تنہا ہیں"

"ہاں احتجاج کروں گا۔ آواز اٹھاؤں گا"

"تنہا ہی سب سے نپٹ سکیں گے آپ؟"

"سب سے نہیں، مگر جو میرے نزدیک ہیں، جو مجھ پر داشت کیچڑ اچھالیں گے ان کو منھ توڑ جواب دے سکوں گا"

"ہوں..... دیبا نے کسی سوچ میں گم ہوتے ہوئے کہا، کیا آدمی بھیڑ میں اکیلا چل سکتا ہے؟ کیا خیال ہے آپ کا؟"

"کیوں نہیں؟ آدمی بھیڑ نہیں ہے کہ ایک بھیڑ جس طرف جاتی ہے تو سب اس کے پیچھے چل پڑیں" تنشادر نے پر اعتماد لہجے میں کہا۔

"ٹھیک کہا آپ نے! ایسا اس لیے ہے کہ آدمی کے پاس فہم و ادراک ہے جانور اس سے محروم ہیں۔ ہاں اگر آدمی عقل سے محروم ہو جائے تو کوئی بھی اس کا رہنما بن سکتا ہے۔ کسی کو بھی آدرش مان کر وہ مل سکتا ہے۔ جیسے جو آگے جا رہی ہوتی ہے اسی کے پیچھے سب بھیڑ یں چل پڑتی ہیں"

"ہاں، ایسا ممکن ہے" تنشاد نے تذبذب کے عالم میں کہا۔

"چند اشخاص کو کانفرنس میں سہولیات نہ ملی ہوں گی۔ نیچے کی منزل پر کمرہ نہ ملا ہو گا۔ نہانے کے لیے گرم پانی نہ دستیاب ہوا ہو گا۔ کھانا پسند نہ آیا ہو گا۔ مگر دوسرے تمام لوگوں کو اس کی شکایت میں شامل ہونے، اس کے ہمدرد بن کر وکالت کرنے کا حق کس طرح مل گیا؟"

تنشاد کچھ نہ بولا۔ پہلو بدل کر رہ گیا۔ اس کے دائیں طرف بیٹھے ہوئے مسافر بڑے انہماک سے کسی موضوع..... یقینی طور پر اسی پرانے موضوع پر بحث کرنے میں مصروف تھے۔ ان دونوں کی طرف کسی کی توجہ نہیں تھی۔

"مذہب، ذات، پات، طبقے وغیرہم کی بنیاد پر سب ہی لوگ ایک دوسرے کے تئیں اپنے دل میں اختلاف رکھتے ہوں گے مگر ہر کوئی ان کا اظہار نہیں کرتا۔ جو ان مذموم خیالات کی آبیاری اپنے دلوں میں کرتے ہیں وہ اپنے موقف پر اتنے مستحکم

ہوتے ہیں کہ دوسروں پر حاوی ہو جاتے ہیں جب کہ پاک طینت اور نرم دل لوگ انہیں ان کی شرمناک رویے اور زہر آلود خیالات سے منتز لزل نہیں کر سکتے کیوں؟

نشاو کو محسوس ہوا دیبا اس پر چوٹ کر رہی ہے اس کے جی میں آیا دیبا سے کہے جہاں تک اس کا سوال ہے وہ پہلے ہی معافی طلب کر چکا ہے .... مگر پھر بھی خاموش رہ جانا اس نے مناسب سمجھا۔ سوچا دیبا کا آکروش جائز ہے۔ وہ خود ہی اعتراف کر چکا ہے کہ ان حالات میں خود پر قابو نہ رکھ سکتا۔ الجھ پڑتا کسی سے۔ دیبا نے بھی یہی کیا ہے۔ ... مگر ہم اس طرح تب سوچتے ہیں جب حالات کا ایک حصہ نہیں ہوتے۔ دیبا کے آکروش کو شانت کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ اسے اس موضوع کے ریگستان سے باہر نکالا جائے۔ اسے یہ سمجھانے کی کوشش کی جائے کہ بھیڑ میں بھٹک جائے تب بھی آدمی، آدمی ہی ہے۔ جانور نہیں کہ ہر دم وہی راہ اپنائے ذرا اشارہ بھر ملے.... ذرا اسے اس کے اشرف المخلوقات ہونے کا احساس بھر دلایا جائے تو سیدھی راہ پکڑ سکتا ہے۔

بھیڑ میں بھٹکا آدمی
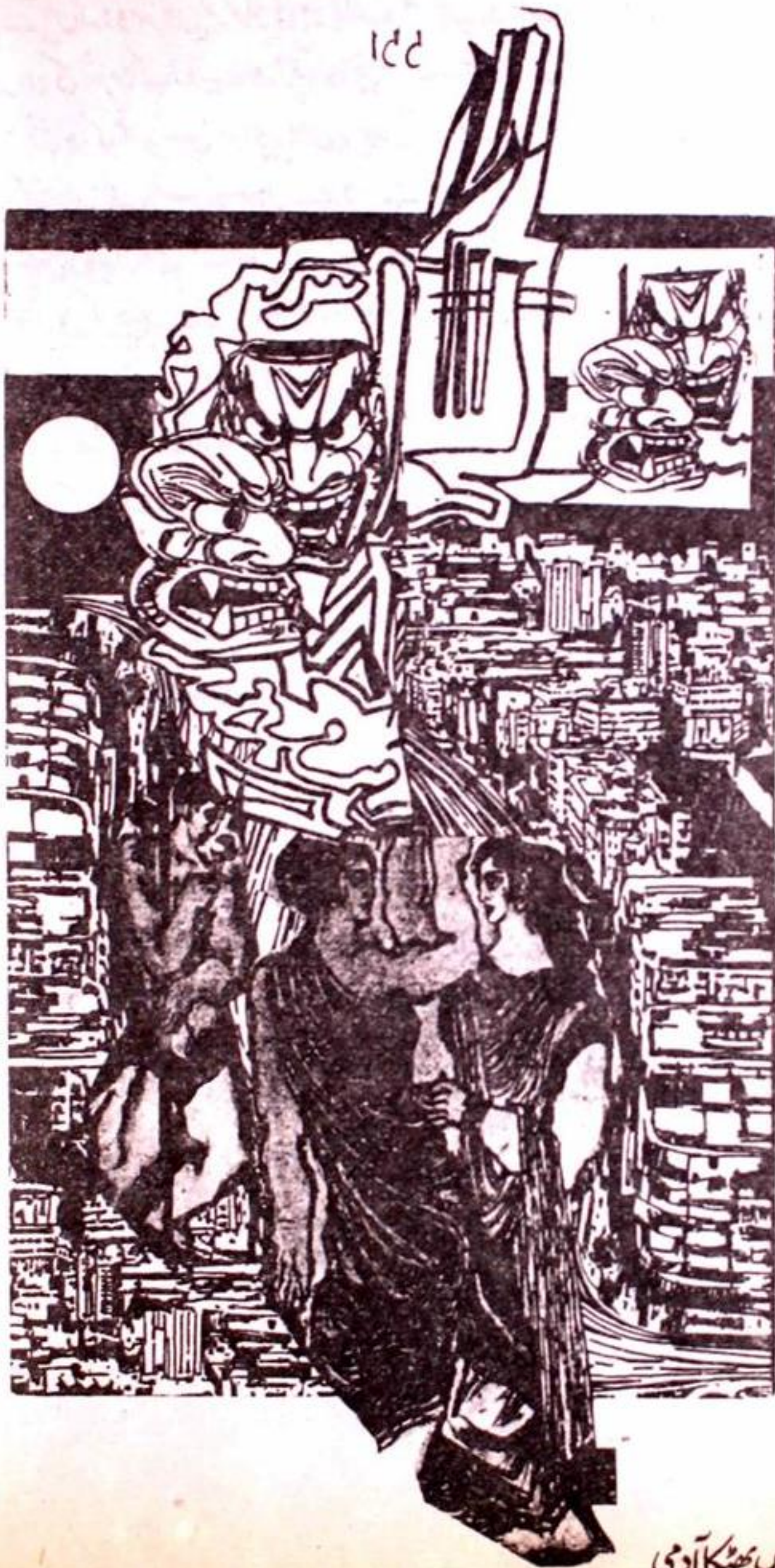
حادثوں کی اس کی زندگی میں خاص اہمیت تھی۔ وہ حادثے، جو کبھی وقوع پذیر نہیں ہوئے تھے۔

وہ ان لوگوں میں سے تھا جو تنہائی ناکامی، بدنصیبی اور بدحالی کا شکار ہوتے ہیں اپنی زندگی خود ختم کر لیتے ہیں یا رو رو کر زندگی گذار لیتے ہیں۔

وہ کبھی خوش شکل اور صحت مند رہا ہوگا مگر تفکرات نے اسی کی صحت کو کھالیا تھا۔ جسم ہڈیوں کا ڈھانچہ بن کر رہ گیا تھا۔ رنگ جل کر سیاہ پڑ گیا تھا۔ ہر وقت کی سوچ اور فکر نے پیشانی پر چار گہری لکیروں کو نمایاں کر دیا تھا۔ آنکھیں بے نور، بجھی بجھی سی تھیں ایک آنکھ گھڑیاں درست کرنے وقت لگائے جانے والے آئی گلاس سے کچھ عجیب شکل کی ہوگئی تھی اسے دیکھ کر خوف معلوم ہوتا تھا۔ جب وہ خیالوں میں گم ہوتا تب وہ آنکھ بالکل بند ہوجاتی۔ وہاں ایک پھپھولا سا دکھائی دیتا۔ گفتگو کرتے وقت الفاظ بے ربط اور خیالات منتشر ہوتے۔ خاموشی کی کیفیت میں پاؤں بلاارادہ ہلتے رہتے۔ ہاتھوں کی انگلیوں کو یا تو چٹخاتا رہتا یا مٹھی کھول کر بند کرتا رہتا احساس تنہائی شدید ہونے پر ہونٹوں ہی ہونٹوں میں کچھ بڑ بڑاجاتا۔ اسے گھریلو پریشانیاں نہیں تھیں

دراصل، گھر جس سے بنتا ہے ان کا اس کی زندگی میں دور دور تک نام و نشان نہ تھا۔ ایک چھوٹی سی جھگی میں رہتا تھا، جو ایک مل کی چار دیواری اور فٹ پاتھ کے درمیان، ڈیڑھ میٹر چوڑی اور ڈھائی میٹر لمبی جگہ گھیر کر بنائی گئی تھی۔ نارپولین کے ٹکڑوں اور پھٹے پرانے چیتھڑوں کو بانسوں پر ٹکا کر نام دیا گیا تھا۔ جھگی کے آدھے حصے میں کوڑے کے ڈھیر پر سے اٹھائے گئے پھٹے کٹے لنولیم کے تین ٹکڑے بچھائے گئے تھے۔ جو اس کے لیے بستر کا کام دیتے تھے۔ ایک کونے میں چھوٹی سی ٹنکی اور المونیم کے دو تین کالے پچکے ہوئے برتن رہتے۔ اس جھگی سے اس کا بس رات بھر سو رہنے کا تعلق تھا۔ کھانا وہ ڈھابے میں کھاتا۔ دن کے چار گھنٹے گھڑیوں کی دکان میں کام کرتا۔ بقیہ وقت آوارہ گردی کی نذر ہوتا۔

وہ کسی کے لیے فکرمند نہ ہوتا تھا۔ اس پر کوئی ذمہ داری نہیں تھی۔۔۔ کوئی دنیا میں اس کا تھا ہی نہیں۔ فٹ پاتھ کی دین تھا وہ۔ ماں باپ دونوں لاری کے پہیے تلے کچل کر مر گئے تھے جو ایک رات فٹ پاتھ پر چڑھ آئی تھی۔ جس روز اسے یہ بات معلوم ہوئی تھی کہ اس کے ماں باپ تھے۔ وہ کافی مطمئن ہوا تھا۔ اپنے حرامی نہ ہونے کے احساس نے اسے کافی تقویت بخشی تھی ورنہ فٹ پاتھ پر پیدا ہونے والے بچوں میں جائز اور ناجائز کی تفریق مشکل ہوتی ہے۔ وہاں رشتوں کی اہمیت نہیں ہوتی۔ ماں باپ بچوں کو جنم دے کر گویا ہر فرض سے بری ہو جاتے ہیں۔ بچے بھی جب تک مرضی ہوتی ہے ان کے کل یہ عاطفت میں رہتے ہیں اور انہیں کما کر دیتے ہیں۔ ذرا سمجھ میں آتے ہی لگام تڑا کر بھاگ نکلتے ہیں۔

اس کے لاشعور میں حادثوں نے گھر کر لیا تھا۔ اس کی زندگی کسی سے وابستہ نہیں تھی اس لیے نہایت بے دردی سے اسے خیالی حادثوں کی عفریتوں کے آگے پھینکتا رہتا۔ جہاز کا سفر اس کے بوتے سے باہر تھا۔ تصور اتنی لمبی چھلانگ، اتنی اونچی اڑان بھرتا ہی نہیں تھا۔ لیکن ریل، موٹر، ٹیکسی تو اس کی پہنچ میں تھیں۔

— وہ بس میں سفر کر رہا ہوتا۔۔۔ ذہن پر خیالات کی یلغار ہوتی۔ وہ سوچتا اس بس کو اگر حادثہ پیش آ جائے؟؟ سامنے سے آتا ہوا کوئی تیز رفتار ٹرک اسے ٹکر مار دے، طغیانی پر آئی ہوئی دریا کی موجیں بس کو بہا لے جائیں؟ یا توازن کھو بیٹھنے

کی بنا پر کسی درخت یا بجلی کے کھمبے سے جا ٹکرائے تو ..... تو ..... چاروں طرف چیخ پکار مچ جائے گی۔ سامنے کی سیٹ پر بیٹھی وہ تھل تھل جسم والی لسندھی عورت مرجانے پر کیسی بھیانک دکھائی دے گی ..... اس توندیل بیوپاری کا ہاتھ ضرور ٹوٹنا چاہیئے جو اپنے بازو بیٹھی لڑکی کو مسلسل ٹہوکے مار رہا ہے ..... وہ اُدھر دو بچے بیٹھے ہیں۔ ان کا باپ ابھی ابھی اپنے ساتھی کو بتا رہا تھا کہ ان بچوں کی ماں نہیں رہی ..... اس حادثے میں ان کے باپ کو بھی مرجانا چاہئے ..... بچے بھی مرجائیں تو واہ واہ! پورا گھر صاف۔

ٹرین کسی پُل پر سے گذرتی ہوتی۔ سگنل کے لیے رکی ہوتی یا بنیز خرامی سے منزل کی طرف رواں دواں ہوتی وہ ہر لمحہ کسی غیر معمولی آواز، کسی دھماکے کا منتظر رہتا۔ ایسی آواز جو حادثے کا پیش خیمہ ہوتی ہے ..... وہ کمپارٹمنٹ میں بیٹھے ہوئے لوگوں کا جائزہ لیتا اور اپنے خیالات کی لگام ڈھیلی چھوڑ دیتا۔ اس وقت وہ یہ قطعی فراموش کر جاتا کہ ٹرین کی دنیا اس کمپارٹمنٹ تک ہی محدود نہیں ہے۔ ہزاروں مسافر اس کی اس نامعقول خواہش کا خمیازہ بھگتیں گے۔

ایک پنجابی دلہن دونوں ہاتھوں میں سونے کی سولہ سولہ چوڑیاں پہنے خوشی سے کھلی جا رہی ہوتی۔ بچے ماؤں کی گود میں کلکاریاں مار رہے ہوتے۔ کوئی کسی سے ملنے جا رہا ہوتا۔ کوئی کسی سے مل کر آنے کی خوشی میں سرشار ہوتا اور وہ ..... وہ ان سب کی خوشیوں پر دکھ کی چادر ڈالنے کے خیال میں مصروف ہوتا۔

اسے کامل یقین ہوتا کہ چونکہ متوقع حادثے کی جانب سے وہی خبردار ہے اس لیے پوری طرح اپنے ہوش وحواس قائم رکھ سکے گا۔ اس نے اخباروں میں پڑھ رکھا تھا کہ اکثر جب سیلاب کی وجہ سے راستے بند ہوجاتے ہیں، ریلیں رک جاتی ہیں تب ندی کنارے بسنے والے لوگ مسافروں کی مجبوری کا خوب فائدہ اٹھاتے ہیں۔ دودھ کا گلاس پانچ روپئے اور ڈورو ٹی سبزی دس روپئے میں بیچتے ہیں۔ ندی میں گر پڑی بس یا ٹرین کے مسافروں کی مدد کرنے کے بجائے ان کی نقدی اور زیورات چھین کر دوبارہ پانی میں دھکا دیتے ہیں ..... وہ کسی کا کچھ نہیں لے گا ..... کسی کے زیورات نہیں اتارے گا۔ کسی کے پاکٹ کی رقم اپنی جیب میں منتقل نہیں کرے گا۔ اتنا اوچھا وہ نہیں

ہے ۔ اسے ضرورت بھی نہیں ہے ۔ کسی کے مال و اسباب کی! وہ تو بس سب کی لاشیں جمع کرے گا.... کٹی پھٹی خون آلودہ لاشیں! لاشوں کا انبار جس قدر اونچا ہو گا وہ اتنا ہی اپنی مستعدی اور چستی پھرتی پر فخر کرے گا ۔ حادثے کی خبر کے ساتھ لاشوں کے ڈھیر کے پس منظر میں اس کی تصویر بھی اخبارات کے صفحہ اوّل پر شائع ہو گی ۔

اس نے اپنے سینے پر چمڑے کی ایک پٹی باندھنی شروع کر دی تھی ۔ اس پٹی کے ایک خانے میں اس کی تصویر اور مختصر احالات زندگی لکھے رکھے تھے ۔ بالفرض وہ بھی حادثے کا شکار ہو جائے تو دنیا اس کے نام و پتہ سے انجان نہ رہے ۔ جو کام وہ جیتے جی نہیں کر سکا یعنی اپنی پہچان، اپنا نام نہیں بنا سکا ہو سکتا ہے وہ کام اسی طرح تکمیل پا جائے ۔ وہ دنیا بھر میں.... نہ سہی دنیا، ملک بھر میں.... ملک بھر میں نہ سہی کم سے کم اس شہر میں مشہور ہو جائے ۔

اخبار کی سرخیاں اس کی آنکھوں میں گھوم جاتیں ۔ بس کے حادثوں کی تاریخ میں سب سے زیادہ بھیانک حادثہ! پچیس مسافر ہلاک.... پچیس زخمی ۔ ٹرین دریا کی طغیانی کی نذر.... دو سو سے زیادہ مسافر لاپتہ.... سیکڑوں ہلاک. نوّے لاشیں نکالی جا چکی ہیں ۔ بقیہ کی تلاش جاری ہے.... اس کا تصور مرنے والوں کی تعداد میں جتنا اضافہ کرتا وہ اتنا زیادہ خوش ہوتا جاتا ۔

شادی کی بارات، گنپتی کا جلوس، یا محرم کے تعزیے دیکھنے کے لیے ہجوم جب عمارتوں کی بالکنیوں اور چھتوں پر کھڑا ہوتا تو وہ ان جلسوں، جلوسوں سے لطف اندوز ہونے کے بجائے ان عمارتوں کے گرنے اور چھتوں کے بیٹھنے کا منتظر ہوتا ۔ سڑک پر چلتے ہوئے ہر دوسرے پل اسے حادثے کی توقع ہوتی.... روزانہ اخبار وہ کسی حادثے کی خبر پانے کی امید میں کھولتا ۔

ایک روز نہانے کے لیے گھر سے نکلا ۔ بہت دور سمندر کے کنارے پہنچ گیا ۔ وہ صرف ایک تہمد باندھے ہوا تھا ۔ نہا دھو کر وہ سڑک پر آیا ۔ ایک طرف کھڑا ہو کر بسوں اور ٹیکسیوں کو دیکھنے لگا کہ کب وہ کس کے چیتھڑے اڑاتی ہیں ۔ خود الٹتی ہیں یا کسی سے ٹکرا جاتی ہیں ۔ بہت دیر تک جب ایسا کچھ نہیں ہوا تو ایک خوبصورت صحت مند بچے پر اس کی نظریں جم کر رہ گئیں ۔ وہ چھ سالہ بچہ ایک بوڑھے شخص کے ساتھ

سیر کو نکلا تھا۔ بوڑھا شخص بار بار منع کرتا۔ بچے کی اچھل کود اور شرارت میں کمی نہ ہوتی۔ ادھر ادھر اچھلتا کودتا، بھاگتا چل رہا تھا وہ .... بچے پر نظر یں جمائے جمائے ایک شیطانی خیال اس کے ذہن میں جاگا.... وہ اس بچے کو کسی موٹر کے نیچے ڈھکیل دے تو ؟ قیمہ قیمہ ہو جائے اس کا ؟ یا ہو سکتا ہے کچلے ہوئے گوشت کا ڈھیر بن جائے۔ بچہ دکھائی ہی نہیں دے گا.... بس گوشت کے ٹکڑے ہوں گے۔ وہ یہ موقع ہر گز نہیں گنوائے گا.... وہ خاموشی سے بچے کے پیچھے پہنچا۔

دوسرے ہی لمحے اس نے بچے کو زور کا دھکا دے دیا۔ چیخ پکار مچ گئی پلک جھپکتے ہی ایک تیز رفتار بس سر سے گذر گئی.... لوگوں کا ہجوم جمع ہو گیا۔ بوڑھا دوزانو بیٹھ کر بچے کو گود میں لے کر چومنے لگا.... وہ زار زار رو رہا تھا.... بچہ حیران تھا۔ سہمی سہمی نگاہوں سے سب کو دیکھ رہا تھا.... اچانک بوڑھے نے بچے کو ایک ہاتھ سے سنبھالے سنبھالے دوسرے ہاتھ سے جیب میں سے نوٹوں کی ایک گڈی نکالی اور اس کی طرف بڑھاتا ہوا بولا۔ "لے لو.... یہ سب لے لو۔ میری جیب اس وقت اتنے ہی روپے ہیں .... پانچ چھ سو ہوئیں گے۔ میرے ساتھ گھر چلو۔ میرا بیٹا اس سے دگنی رقم نہیں دے گا۔ یہ میرے بیٹے کا اکلوتا بیٹا ہے اگر تم دھکا نہ دیتے تو یقیناً یہ موٹر کے نیچے کچلا گیا ہوتا۔ میرے خاندان کا چراغ بجھ گیا ہوتا.... میں اپنے بیٹے کو کیا جواب دیتا؟ کیا کہتا کہ اس کا بیٹا مر گیا.... نہیں نہیں مسیحا! اسے لے لو.... انکار نہ کرو۔ خدا کے لیے اسے لے لو۔"

وہ حیران نگاہوں سے خلاء میں تکتا کھڑا تھا۔ یہ کیا ہو گیا؟ اس حادثے کا تو اس نے تصور ہی نہیں کیا تھا.... اچانک وہ چکرا کر گر پڑا.... اس کے دل کی دھڑکن بند ہو چکی تھی۔

ڈاکٹر اجے کی پیتھالوجی لیبارٹری اندر گلی میں تھی۔ وہاں تک جانے کا راستہ کیچڑ سے اٹا پڑا تھا۔ پچھلی رات موسلا دھار بارش ہوئی تھی آسمان ابھی بھی کالے بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا اب برسا تب برسا کی حالت میں سب لوگ بازار کا کام جلدی جلدی نپٹانے کی فکر میں تھے کہ کہیں ایسا نہ ہو گھر پہنچنے سے پہلے بارش انہیں گھیر لے۔

اکھل اپنی بیوی نشا کو اسکوٹر کے پاس کھڑے رہنے کا کہہ کر کیچڑ میں رکھے گئے بڑے بڑے پتھروں پر احتیاط سے قدم جماتے ہوئے گلی میں بڑھ گئے.... نشا وقت گذاری کے لیے ادھر ادھر نظریں دوڑانے لگی۔ گلی کے سرے پر لگی ڈاکٹر اجے کی نیم پلیٹ پر اس کی نظر جم گئی۔ ایم۔ بی۔ بی۔ ایس۔ ایم۔ ڈی.... اور پھر لو۔ ایس۔ اے۔ کی کوئی ڈگری.... ایک طنزیہ مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر پھیل گئی.... ہم ہندوستانی لوگ غیر ممالک میں جاتے ہیں مگر وہاں کی تہذیب و تمدن سے کیا سیکھیں کیا نہ سیکھیں یہ قابلیت ہم میں نہیں۔ ہنس کی مانند پانی چھوڑ کر دودھ پی لینے کا فن سب کو تو نہیں آتا نا! جو غیر ملکی ڈگری ہزاروں کی آمدنی کا ذریعہ بن رہی ہے۔ اس غیر ملکی تہذیب سے صفائی سے رہنے کا سلیقہ، اور سبق نہیں سیکھا ڈاکٹر نے۔ شہر کا سب سے مشہور پیتھالوجسٹ ہے۔ اس بات کو اچھی طرح

جانتا ہے کہ لیبارٹری پُر فضا مقام پر شاندار عمارت میں واقع ہو یا گندی گلی کے اندھیرے کمروں میں، جیسے آنا ہوتا ہے جھک مار کر آتا ہے۔

شہر میں پرائیوٹ پریکٹس کرنے والے زیادہ تر ڈاکٹروں سے ڈاکٹر اجے کا معاہدہ ہے عوامی شفاخانہ کے بہت سے ڈاکٹروں کی بھی ملی بھگت ہے.... عوام کے لیے جو شفاخانہ بنایا گیا ہے اس شفاخانہ میں کام کرنے والوں کی کارگذاری پر جب وہاں کے ڈاکٹر خود ہی شبہہ ظاہر کرنے لگیں تو عام آدمی پرائیوٹ پیتھالوجسٹ کے پاس نہ جائے گا تو جائے گا کہاں؟ اسے کہتے ہیں لنگوٹی میں پھاگ کھیلنا.... ڈاکٹر اجے کی لیبارٹری میں پورے اعتماد کے ساتھ خون پیشاب کی جانچ کرائی جاسکتی ہے یہاں عوامی شفاخانے کی طرح رپورٹ وقت پر نہ ملنے، صحیح جانچ نہ ہونے یا رپورٹ بدل جانے کا امکان نہیں ہوتا۔

اچانک شور اٹھا....

"مارو.... مارو سالے کو.... مار مار کر سر گنجا کر دو.... مارو.... مارو....

نشا نے گھبرا کر سڑک کی طرف رخ کیا۔ سامنے میونسپل پارک سے لوگوں کا ہجوم باہر آرہا تھا۔ اسے سمجھ بیٹھنے میں دیر نہ لگی۔ ضرور ہی کوئی کسی کی جیب پر ہاتھ صاف کرتا ہوا پکڑا گیا تھا۔ بھیڑ بھاڑ کی جگہوں پر آج کل ایسی حرکات عام ہو گئیں ہیں....

"مارو.... مارو...."

پھر وہ اسے دکھائی دے گیا۔ نحیف و نزار جسم، مٹ میلا کرتا پاجامہ پہنے وہ شخص دونوں ہاتھوں سے سر کو بچانے کی کوشش کر رہا تھا۔ جوتے، دو ہتھڑ.... مار.... گالی.... نفرت، غصہ....

نشا کا دل پسیجنے لگا.... گرہ کٹ دوسروں کے حقوق پر ڈاکہ ڈالنے اور دوسروں کی پریشانی کا سبب ضرور بنتا ہے، وہ جرم کا ارتکاب کرتا ہے مگر کیا اس سے ہر کسی کو اسے مغضوب کرنے کا حق مل جاتا ہے؟ قانون آخر کس لیے ہے؟.... نشا نے اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں۔ قانون کے محافظوں کی نااہلیت ہی عوام کو قانون ہاتھ میں لینے پر مجبور کرتی ہے شہر کی بھری پری سڑک تھی۔ پارک میں آنے جانے والوں کی چہل پہل الگ۔ دکانوں پر لوگوں کا ہجوم تھا۔ پندرہ منٹ ہو چکے تھے۔ شور دس دکان دور سے نمائش بینوں کو کھینچ لا رہا تھا مگر آس پاس کسی سپاہی کا ڈنڈا نہ بجا تھا۔ کیا ہو رہا ہے سالو؟ یہ بھیڑ کیوں لگا رکھی ہے۔

دو ہٹو سالو..... حرامی کی اولاد..... سر پر کیوں چڑھا آرہا ہے..... جیسے مانوس جملے کانوں میں نہ پڑے تھے۔ نشا نے طویل سانس لی جیسے محکمہ پولس کی نااہلیت پر افسوس ظاہر کر رہی ہو..... پھر اس نے نظریں پٹ رہے شخص پر مرکوز کر دیں۔

ایک دادا قسم کے شخص نے اسی وقت پیچھے سے اس کی کمر پر لات جمائی..... حرامی کتے کے پلے..... سالے حلق تک چڑھا لیتے ہیں پھر ماں بہن دکھائی دے تو کیسے؛

لات کھا کر دوسرے ہی لمحے وہ بیدھا نشا کے قدموں میں آگرا.....

"اوق..... بھل..... بھل....." ڈھیروں گندگی میں نشا کے پاؤں لتھڑ گئے ــ وہ قے کر رہا تھا۔

جیسے ہی نشا پر اس گھناونی حقیقت کا انکشاف ہوا اس نے ایک بھیانک چیخ مار کر آنکھیں بند کر لیں ایک قدم آگے بڑھا یا نہ پیچھے ہٹی۔ پتھر کی مورت کی طرح وہیں نصب رہ گئی۔

"ہٹو سالو..... رستہ دو۔ کیا ہوا؟ کون چیخا تھا ابھی؟"

سوالات کی بوچھار کرتا ایک سپاہی آخر نمودار ہو ہی گیا۔ دم بخود بھیڑ کو چیرتا ہوا وہ اندر گھس آیا۔ نشا پر نظر پڑی تو گھبرا کر بولا۔ "بائی صاحب آپ؛

اکھل بھی تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا اب تک وہاں پہنچ چکے تھے۔ بپاہی اسے دیکھتے ہی اٹینشن ہو گیا۔ ایک زوردار سلیوٹ اسے جھاڑ کر نزدیکی ہوٹل کی طرف رُخ کر کے حلق پھاڑ کر چلایا۔ "ارے چھوکرے ایک بالٹی پانی لا جلدی....."

چلانے سے اس کی تسکین نہ ہوئی تو خود بھی ہوٹل تک دوڑ گیا..... اور بالٹی میں پانی لے کر لوٹا..... شرابی کی ٹانگیں پکڑ کر گھسیٹ کر اسے ایک طرف کرتا ہوا بڑبڑایا۔ "نبٹرے سے تو بعد میں سمجھوں گا۔"

"گڑھ..... گڑھ....." بالٹی سے پانی اس کی ساڑی اور پاؤں پر ڈالا جانے لگا۔ بائی صاحب! ایک طرف ہٹ جائیے۔ گندگی دھل گئی۔"

مگر نشا کے کانوں میں وہ گھناونی آواز گونج رہی تھی..... اوق..... بھل۔ بھل

"نشا! کیا ہو گیا ہے تمہیں؟" اکھل نے اسے کندھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑ دیا.....

نشا کی آنکھیں کھلیں۔ نیچے اپنے پاؤں کے قریب پڑے ہوئے شخص پر پڑیں۔ نشا سائی

کی لہر آنکھوں میں پھیلی — بابو داؤ .... بابو داؤ تھا وہ ....

"اف میرے خدا!" وہ بڑبڑائی اور دوسرے ہی لمحے لہرا کر اکھل کی بانہوں میں

لے گئی — جب نشا کو ہوش آیا وہ اپنے مکان میں، اپنی خواب گاہ میں لیٹی تھی اکھل ڈرائنگ روم

میں شاید ڈاکٹر مہرہ سے بات کر رہے تھے .... ڈاکٹر مہرہ کی آواز وہ خوب پہچان رہی

تھی — وہ کہہ رہے تھے۔

"لیڈیز عموماً نازک مزاج اور نفاست پسند ہوتی ہیں۔ وہ گھناؤنی سچویشن برداشت

نہیں کر سکتیں .... میڈم کو شاک پہنچا ہے۔ آہستہ آہستہ نارمل ہوں گی۔"

اکھل فکر مند تھے — "ڈاکٹر وہ پہلے ہی بہت کمزور ہو رہی ہے۔ کالج سے اس

نے رخصت لے رکھی ہے۔ خون، پیشاب کی جانچ کروائی ہے۔ اسی کی رپورٹ لینے ہم گئے تھے"

"ڈونٹ وری مسٹر اکھل! گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ کمپلیٹ ریسٹ دیجئے انہیں اور

اس بات کا خصوصی دھیان رکھیں کہ دوبارہ اس واقعے کا ذکر ان کے سامنے نہ ہو ...."

ادھر نشا کی آنکھوں کے سامنے وہ منظر اب بھی فلم کی طرح چل رہا تھا .... بابو رام کا پژ

مردہ چہرہ رہ رہ کر اسے یاد آ رہا تھا۔

بابو رام اس کے کالج میں کلرک تھا .... کئی دنوں تک وہ اس بات سے لاعلم رہی

کہ وہ ایک نمبر کا شرابی ہے۔ انکم ٹیکس کے کسی سلسلے میں نشا کو ایک روز اس کی ٹیبل تک

جانا پڑا تو وہ گڑبڑا گیا — "میڈم! آپ نے کیوں کشٹ کیا؟ کشن سے کہلا دیا ہوتا۔ میں فوراً آپ

کا کام کر دیتا۔"

اسٹاف میں وہ اکیلی لیڈی لکچرر تھی .... احتراماً بابو داؤ نے ایسا کہا ہوگا نشا کی یہ

خوش فہمی جلد دور ہوگئی۔ کشن نے سچ بات اگل دی — "میڈم، ہر دم نشے میں دھت

رہتا ہے وہ!"

"ڈیوٹی کے اوقات میں بھی؟" نشا نے حیرت سے پوچھا تھا۔ تعلیمی اداروں کی

اخلاقی گراوٹ میں ایسے ہی ناپسندیدہ عناصر کا ہاتھ رہتا ہے۔ "بڑے صاحب کچھ

نہیں کہتے۔"

"سب طرح کی کوشش کر کے ہار گئے وہ! اس کی تنخواہ کاٹی، اسے اسپتال بھیج کر

ڈاکٹری معائنہ کرایا، پولس میں رپورٹ لکھائی .... مگر سب بے سود! اب تو یہ حال ہے کہ

جس دن ڈیوٹی پر نہ آئے سمجھ لیا جاتا ہے کہ پی کر کہیں پڑا ہوگا۔،،

دل ہی دل میں نشا نے اس وقت پرنسپل کو الزام دیا تھا کہ کیوں وہ اس کے خلاف ایکشن نہیں لیتے.... ان کے رحمدلانہ رویئے کے پس پشت ان کی کوئی مجبوری ہوگی یہ تو وہ اس روز بھی جب پی کر اُدھم مچانے کے جرم میں بابو رام پکڑا گیا اور اس کی بیوی نے آکر نشا کے پاؤں پکڑ لیے۔ نشا کے اصرار اکھل نے بابو رام کو بری تو کرا دیا مگر ایک لمبا بھاشن جھاڑنے کے بعد۔

نشا نے کالج میں اسے بہت سمجھایا۔ "یہ بڑی عادت ہے بابو رام۔ اسے چھوڑ دو ....،،

بابو رام اس سے وعدہ کرتا رہا۔ وعدہ توڑ کر پیتا رہا۔

چار ماہ بعد ہی دوبارہ پکڑا گیا۔ تمام رات سپاہیوں نے تھانے میں بند رکھا اور خوب مرمت کی۔ سویرے اس کی بیوی پھر نشا کے دروازے پر موجود تھی۔ یوں روئی یوں گڑگڑائی جیسا نشا بچا نہیں لے گی تو تھانے سے بابو رام کی لاش ہی نکلے گی.... وہ کشمکش میں مبتلا ہوگئی۔ اکھل ایک قتل کے کیس میں اسپاٹ انسپکشن کے لیے گئے ہوئے تھے.... ادھر بابو رام کی بیوی کی گریہ وزاری اس سے برداشت نہیں ہو رہی تھی خاصے پس و پیش کے بعد نشا نے تھانے فون کر دیا تھا۔

اکھل لوٹ کر آئے تو نشا نے اس واقعے کے بارے میں سن کر پہلے تو چپ لگا گئے پھر رکھائی سے بولے۔ "آئندہ سے غیر ذمہ دارانہ کام نہ کرنا۔،،

"کیوں؟،، نشا کو اس کا طرز تخاطب پسند نہ آیا۔

"بس میں یہ پسند نہیں کرتا۔،،

نشا بھبک کر بولی تھی "دوسرے افسروں کی بیویوں کی طرح میں تھانے دار سے مرغی، مچھلی کی فرمائش نہیں کی، کوکو کولا کے کریٹ نہیں منگوائے۔ فلم کے ٹکٹوں کی مانگ نہیں کی، اپنی سہیلیوں کے لیے ڈنر اور لنچ کا انتظام کرنے کو نہیں کہا بیگار کرنے کو نگر وٹ نہیں بلائے۔ اپنے ایک کلرک کی سفارش ہی تو کی ہے۔،،

نشا کے اس طرح مشتعل ہو جانے سے اکھل کو احساس ہوا کہ وہ اپنا موقف بخوبی واضح نہیں کر پائے ہیں اس لیے ذرا نرم پڑ کر بولے۔ "تم اپنے الفاظ کی نفی کر رہی ہو

ترقی کی دوڑ، مقابلے کی دوڑ، بچاؤ کی
دوڑ وغیرہ میں روزگار کی دوڑ سب سے تیز
ہوتی ہے۔ اس دوڑ نے ہمارے گاؤں کو
گاؤں نہیں رہنے دیا۔ پہلے اس نے گاؤں کے
نوجوان کو شہر کی طرف دوڑایا اور اب شہر کے
نوجوانوں کو غیر ممالک خصوصاً عرب ملکوں کی
طرف دوڑا رہی ہے۔ ہمارے شہر کے تین
فیصد نوجوان اس دوڑ کو جیت کر ریاض، شارجہ،
دوبئی اور کویت پہنچ چکے ہیں.... اور اب تو
شہر کا ہر پانچواں نوجوان وہاں پہنچنے کے
لیے بے تاب ہے۔

عدنان، میرے شوہر، دو برس قبل
اس دوڑ کو جیت چکے تھے۔ جس سال انہوں نے
اپنی انٹرن شپ ختم کی اسی سال انہیں دوبئی
میں پوسٹ مل گئی۔ عرب ممالک میں تیل کی
دریافت کے بعد جیسے وہاں کے باشندوں کے
نظریات اور رہن سہن کے معیار بدل گئے ہیں
اسی طرح وہاں بغرض ملازمت جانے اور
رہنے والوں کے مزاج بھی بدل گئے ہیں۔ وہ
اپنے آپ کو سید سردار سمجھنے لگے ہیں، پیدائشی
رئیس لکھانے لگے ہیں۔ بڑے میاں تو بڑے
میاں، چھوٹے میاں سبحان اللہ۔ عرب شیوخ
حرم رکھتے ہیں۔ ان کے ملک کی لڑکی بیگم
خاص یا ملکۂ عالیہ اور ہمارے غریب ملک
کے حیدرآباد جیسے شہروں کی کھانے کپڑوں کو

.... ۔ میں کہتی تو کیا؟ گائے کا مالک جب گائے کو فروخت کرنے کا مصمم ارادہ کر لیتا ہے تو گائے کی آنکھوں کی زبان سمجھنے سے صاف انکار کر دیتا ہے۔....

میری شادی عدنان سے ہو گئی۔ جٹ منگنی پٹ بیاہ۔ ساڑیاں، سنڈلیں، زیورات کاسمیٹکس، میرے غرض کہ ہر چیز دوبئی کی تھی۔...غیر ملکی سامان کے اس انبار میں صرف میں ہی ایک دیسی تھی.... عدنان بھی دیسی کہاں رہ گئے تھے؟... مجھے تو بدیسی ہی لگتے تھے۔ ہر دم وہاں کی باتیں.... وہاں کی شان و شوکت کا بیان، وہاں کی عیش و عشرت کی زندگی پر لیکچر، مگر ایک بات تھی، اس آبنوسی رنگت والے جسم میں، سچ مچ ہیرے جیسا دل تھا مجھے بہت پیار دیا انہوں نے.... انہوں نے میری مرضی دیکھ کر چلنا شروع کیا تو میں بھی ان کی سب عادتوں کو سر آنکھوں پر جھیلتی گئی.... بس ایک شکایت رہ گئی.... وہ دن رات روپے پیسے کا جوڑ لگایا کرتے۔ " دو لاکھ کا بنگلہ بنائیں گے۔ دو لاکھ فکسڈ ڈپازٹ میں رکھوں گا.. دو لاکھ کی تمہاری جیولری ہوگی۔ دو لاکھ.... " لاکھ کے نیچے کی گنتی جیسے وہ بھول گئے تھے۔ جب کہ میں نے ابھی ہزار کی گنتی بھی نہ سیکھی تھی۔

عدنان کے دوبئی لوٹنے کے دن قریب آئے تو میں بہت اداس ہو گئی۔ ... اب کب آئیں گے؟"

" اگلے سال.... ان ہی دنوں میں...." وہ بولے تھے.... " مگر اداس نہ ہو تسنیم! درمیان میں طائف بھجتا رہوں گا۔"

میرے دل کو ٹھیس پہنچی کیسی واہیات ذہنیت ہو گئی ہے ان کی؟ کیا میں نے تحفے طائف کے لالچ سے شادی کی ہے؟ مگر ان کی روانگی کے وقت انہیں ملول نہیں کرنا چاہتی تھی اس لیے دل کی بات دل میں رکھ کر کہا.... " عدنان اگر آپ اجازت دیں تو میں اپنی قانون کی پڑھائی دوبارہ شروع کر دوں؟ سال اوّل کا امتحان پاس کر چکی ہوں۔ آپ کی غیر موجودگی میں ویسے بھی دل تو بہلانا ہے۔"

" نہ تسنیم! قانون ہرگز نہ پڑھو! کوئی بھی ٹکنیکل کورس چاہے کرلو۔ پھر تمہیں بھی دوبئی لے جاؤں گا دونوں مل کر روپیہ کمائیں گے۔"

روپیہ.... روپیہ.... روپیہ.... آخر کتنا کمانا ہے انہیں! میں نے کچھ بد دلی سے دریافت کیا تھا۔ " مگر قانون کی پڑھائی کیوں نہ کروں؟"

"اس لیے کہ وہاں وکیل نام کی کوئی مخلوق نہیں پائی جاتی۔ مدعی اور مدعا علیہ قاضی کے سامنے حاضر ہوتے ہیں۔ قاضی دونوں کے بیان سنتا ہے اور فوری فیصلہ صادر کر دیتا ہے۔"

اتنے کم عرصہ میں ہی عدنان اسے وہاں کی باتیں سن سن کر میں بور ہو گئی تھی ۔۔ یہ پہلی بات مجھے اچھی لگی واقعی یہ وکیل ذات نہایت نامعقول ہوتی ہے۔۔۔۔ ابلیس کی اولاد جو مقدمے کو کچھ کا کچھ بنا دیتی ہے۔ سیاہ کو سفید، سفید کو سیاہ ثابت کر دیتی ہے۔

عدنان چلے گئے۔ میں نے پورا ایک سال یہ سوچنے میں گذار دیا کہ کون سا کورس جوائن کروں۔ دوبئی جانے کا میرا دل نہ تھا۔۔۔۔ بس عدنان کی قربت حاصل کرنے کے لیے جانا چاہتی تھی۔۔۔۔ مگر عدنان نے ایک واقعہ کا ذکر کیا تو میں نے کھڑے گھاٹ وہاں جانے کی تیاری کر لی۔

"وہ ایک انجینئر تھا۔ بھارت سے نیا نیا دوبئی پہنچا تھا۔ وہاں کے قاعدے قوانین سے یا تو ناواقف تھا یا انہیں نظر انداز کر گیا۔ اس کے فلیٹ کے سامنے والے فلیٹ میں ایک عرب خاندان آباد تھا۔ اس خاندان کی ایک لڑکی اسے پسند آگئی۔۔۔۔ وہ اسے اشارے کرنے لگا۔ اپنے ملک کی تہذیب سے یک لخت مختلف تہذیب کی پروردہ اس لڑکی نے اپنے والد سے شکایت کر دی۔ والد نے قاضی سے فریاد کی۔ قاضی نے جوان کو عدالت میں طلب کر کے جواب مانگا۔ نوجوان انجینئر نے الزام قبول نہیں کیا۔۔۔۔ قاضی نے ایک لمحہ کی تاخیر کیے بغیر اسے باعزت بری کر دیا۔" عدنان نے رک کر طویل سانس لی۔۔

"پھر۔۔۔۔ پھر کیا ہوا؟" تسنیم کا تجسس انتہا کو پہنچ گیا۔

"سپاہیوں کو نوجوان کی خفیہ نگرانی پر مامور کر دیا گیا۔ جنہوں نے لڑکی کے فلیٹ میں جا بجا مووی کیمرے فٹ کر کے ثبوت اکٹھا کر لیے کیونکہ عدالت سے بری ہو کر نوجوان نے بلا خوف و خطر پھر سے وہی حرکتیں شروع کر دی تھیں۔ ثبوت ہاتھ میں آتے ہی نوجوان کو گرفتار کر کے عدالت میں پیش کیا گیا۔ نوجوان نے اپنی صفائی میں خود کو بے گناہ ظاہر کیا۔ مگر اس مرتبہ مووی کیمرے سے کھینچی گئی تصاویر اسے دکھائی گئیں۔ چار و ناچار نوجوان کو الزام قبول کرنا پڑا۔ قاضی نے فوراً فیصلہ سنا دیا کہ اس جرم کی پاداش میں نوجوان کی آنکھیں نکال لی جائیں۔ سزا سنا کر نوجوان کو مقررہ دن تک کے لیے آزاد چھوڑ دیا گیا۔ اس کی جان

لبوں پر آ گئی تھی۔ راتوں رات اس نے فرار کی کوشش کی مگر سرحد پر پکڑ لیا گیا۔۔۔ اور پھر اسے فلیٹ تک محدود کر دیا گیا۔۔۔ آخر کار مایوسی کی انتہائی منزل پر پہنچ کر نوجوان نے اسی رات بلڈنگ کے چھت سے کود کر خودکشی کر لی۔۔۔

عدنان کی رنگیلی طبیعت سے میں خوب واقف تھی میرے ساتھ باہر جاتے تو جہاں سو آنکھیں مجھے رشک سے دیکھتیں وہاں عدنان مسٹری بی کو لپے منکاتی، گہرے اور بھڑے میک اپ والی عورتوں کو گھورنے سے نہ چوکتے۔ اونچی پوری فربہ جسم والی عورتیں خصوصاً انہیں اپنی طرف مائل کرتی تھیں۔ حالانکہ حد سے آگے وہ کبھی نہیں بڑھے لیکن مجھے رہ رہ کر یہ خیال آتا تھا کہ کہیں وہاں بھی وہ ایسی ہی حرکت کرتے ہوں تو؟۔۔۔ کچھ آگا پیچھا ہو جائے تو میرا کیا ہوگا؟ — میں نے یہ نہیں سوچا کہ عدنان کئی برسوں سے دوبئی میں رہتے ہیں جب ان دنوں کچھ غلط نہیں ہوا تو اب کیسے ہوگا؟۔۔۔ مگر شک تو آئینے کا بال ہوتا ہے۔ پڑ گیا سو پڑ گیا

دوبئی کے اپنے شاندار فلیٹ میں، بیٹھی بیٹھی جو یہ پرانی باتیں بتا رہی ہوں تو شاید پس منظر سے واقف کرا رہی ہوں کیونکہ اب میں وہ حالات بتانے جا رہی ہوں جن سے آج کل دوچار ہوں۔ ادھر آٹھ مہینوں میں اس ملک کی شان و شوکت نے مجھے جتنا متاثر کیا ہے اس سے کہیں زیادہ اس خیال کو پختگی ملی ہے کہ اپنا دیش، اپنا دیش ہی ہوتا ہے۔ عزت کی روکھی سوکھی غلامی کے نان کباب سے بدرجہا بہتر ہے۔ دولت کی افراط نے عربوں کے اخلاق تباہ کر کے رکھ دیے ہیں۔ وہ عرب قوم، جس نے ایک وقت عالم کو عالم اسلامی بنانے کا عزم لے کر جہاد کیا تھا ان عربوں کی اخلاقی پستی کی کہانیاں آج زبان زد عام ہیں۔ عیاشی کے لیے پانچ ستارہ ہوٹلوں میں قیام کرنا، لباس کی طرح عورتیں بدلنا۔۔۔۔ دولت کا نشہ سر پر چڑھ گیا ہے۔ منّی ہے سب علاوہ ازیں مگر میں دیکھتی کہ عدنان ڈیوٹی پر سے کبھی ہشاش بشاش نہ لوٹتے۔ مجھ سے ہنس بول کر اپنی اداسی چھپا لیتے۔ رفتہ رفتہ مجھ پر حقیقت ظاہر ہوگئی کہ یہاں ہندوستانیوں کے ساتھ اچھا سلوک نہیں ہوتا۔۔۔ بُری طرح دُھتکارے جاتے ہیں۔ یہ میری انا کو چوٹ پہنچی، میرا شوہر جسے میں ہمیشہ سربلند دیکھنا چاہتی ہوں وہ دولت کے لیے دوسروں کے آگے سر جھکائے یہ مجھے ہرگز منظور نہ تھا۔۔۔ یعنی ڈاکٹر لال سچ کہتے تھے۔

ڈاکٹر لال ابا جان کے دوست تھے۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے یو۔ایس۔اے گئے تھے۔ آٹھ ماہ میں لوٹ آئے۔۔۔ ابا جان سے دوران گفتگو میں نے سُنا۔ وہ کہتے تھے۔

"ہندوستانی نہ جانے کیوں جوتے کھانے باہر جاتے ہیں۔ وہاں کے اسپتالوں کے مریض غیر ملکی ڈاکٹروں کے سایے سے بھی دور رہتے ہیں۔ مریض کی ڈاکٹر کو خوشامد کرنی پڑتی ہے.... اپنی جیب سے رقم دینی پڑتی ہے تب کہیں جاکر وہ معائنہ کرنے دیتے ہیں۔"

میں نے ایک روز ان کی گفتگو میں دخل دیتے ہوئے کہا تھا۔ "ملک کا ٹیلنٹ باہر نہ جائے اس کے لیے سرکار کوئی قدم کیوں نہیں اٹھاتی؟ ملک ان پر ان کی تعلیم پر خرچ کرتا ہے اور پڑھ لکھ کر وہ دوسرے ممالک کو اپنی خدمات سے مستفیض کرتے ہیں۔ دوسرے ممالک کی ترقی میں غیر محسوس طریقے پر مدد دیتے ہیں.... مانا کہ وہ زر مبادلہ فراہم کرنے کا ذریعہ بنتے ہیں مگر ایک ملک کے لیے روپیہ ہی تو سب کچھ نہیں ہوتا۔"

میرے خیالات جان کر ڈاکٹر لال نے مجھے شاباشی دی تھی مگر ابا جان کو میرے باغیانہ خیالات پر سخت اعتراض ہوا تھا۔ شاید اس وقت عدنان ان کی نظروں میں آچکے تھے اس کے بعد وہ ڈاکٹر لال کے مکان پر خود چلے جاتے تاکہ ان کی باتیں سُن سُن کر میں غیر ممالک میں جانے اور جاکر رہنے کے خلاف نہ ہوجاؤں.... ڈاکٹر لال ایک روز ایک پرانا اخبار لے کر آئے تھے۔ ٹرک کے حادثے میں دو بھائیوں میں سے ایک کے موقع واردات پر ہلاک ہونے اور دوسرے کے اپاہج ہوجانے کی خبر تھی۔ جو بھائی ہلاک ہوا تھا اس کی حال ہی میں منگنی ہوئی تھی۔ خبر میں اس کی بھابی کے مبالغہ آمیز، ڈرامائی بیان مختلف اخباروں میں شائع ہوئے تھے۔ ان کی بھابی مشہور فن کار تھی اور اپنی اول جلول حرکتوں، خود پرستی اور مغرور فطرت کے لیے کافی بدنام تھی.... ڈاکٹر لال نے بتایا دونوں بھائی کناڈا میں اسمگلنگ کرتے تھے۔ جہاز بھر بھر کر انسانوں کو اسمگل کرنا ان کا خاص پیشہ تھا۔ وہ حادثے میں نہیں، پولس سے مڈبھیڑ میں مارے گئے تھے۔ لاکھوں کروڑوں کماتے تھے مگر دھوبی کے کتے کی طرح نہ گھر کے تھے نہ گھاٹ کے۔ غدار تھے اپنے انجام کو پہنچے۔ اچھا ہوا۔ حفاظت کے لیے اپنے ملک کا سہارا ہونا بہت ضروری ہے۔

میں نے عدنان کو ہندوستان لوٹ چلنے کے لیے مجبور کرنا شروع کردیا۔ عدنان راضی نہیں ہوئے۔ میرا کہنا تھا۔۔۔ "اگر تم میں قابلیت ہے عدنان تو تم اپنے ملک میں بھی ترقی کرسکتے ہو.... ابھی تمھاری پہچان تمھارے ملک میں صرف اتنی ہے کہ تم غیر ملک میں ملازمت کرتے ہو۔ میں چاہتی ہوں تم اپنی خدمات اپنے ملک کے لیے وقف کردو۔"

میں سمجھاتے بجھاتے تھک گئی۔ عدنان نہ مانے اور میں نے ایک عزم کر لیا . . . .
عدنان سے کہا "عدنان! میں خلع مانگتی ہوں۔ مجھے خلع دے کر اپنی زندگی سے علاحدہ کر دو"۔

عدنان متحیر ہو کر مجھے دیکھنے لگے۔ پھر پوچھا "اپنے فیصلے پر نظر ثانی نہیں کرو گی؟"
میں نے دل پر پتھر رکھ کر کہہ دیا۔ "نہیں۔"
بس، عدنان یہاں مجھ سے ہار گئے۔

تقریباً چار ماہ بعد ہم جب سویرے چار بجے بمبئی ایرپورٹ پر پہنچے تو میرا دل پھول سا ہلکا ہو رہا تھا۔ اپنے ملک کی کشش آخر مجھے کھینچ لائی تھی . . . . ٹیکسی میں بیٹھ کر میں نے ہاتھ میں پکڑا ہوا اخبار کھولا۔ پہلے ہی صفحے پر جلی سرخیوں میں خبر تھی۔ "ایم۔ بی۔ ایس کرنے کے بعد پانچ برس تک غیر ملک میں ملازمت کے لیے جانے پر پابندی"
میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں عدنان کے کاندھے پر سر رکھ کر بولی "کاش یہ پابندی گورنمنٹ نے چند برس پہلے لگائی ہوتی۔ میری زندگی کے چار انمول برس مٹی میں تو نہ ملتے۔"

عدنان بھی شاید یہی سوچ رہے تھے . . . . آہستگی سے بس اتنا ہی کہہ سکے "پابندی کبھی بھی لگے۔ انجام اچھا ہی ہوتا ہے تسنیم۔"

تاڑ کے بلند و بالا درختوں کے پیچھے بل کھاتی اٹھلاتی، پران ہتنا، ندی، بہہ رہی ہے۔ مہاراشٹر کی مغربی سرحد کے علاقے کی سب سے بڑی ندی ہے یہ۔ کچھ فاصلے پر "سوم نور" میں جہاں سے آندھرا پردیش اور مدھیہ پردیش کی حدود شروع ہوتی ہیں اس ندی کا اندراوتی ندی سے سنگم ہوتا ہے اندراوتی مدھیہ پردیش سے آتی ہے پران ہتنا، مہاراشٹر کی ندی ہے "سوم نور" میں یہ دونوں گوداوری سے مل جاتی ہے۔ اور گوداوری پھر آندھرا کی طرف بڑھ جاتی ہے۔
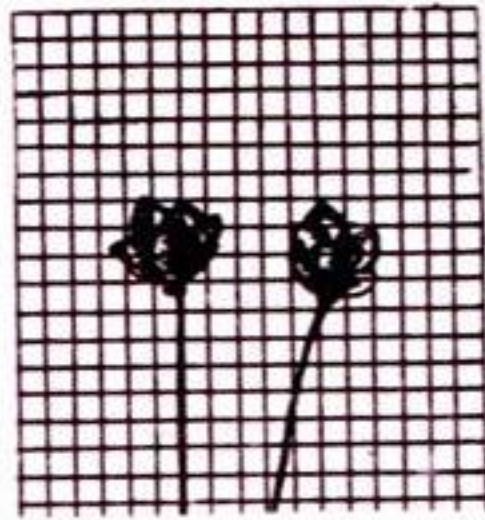
"سرونچا" مہاراشٹر کے سب سے زیادہ پسماندہ ضلع کا پسماندہ علاقہ ہے۔ ادھر ریل نہیں جاتی۔ بس کا راستہ ہے مگر وہ راستہ بہت ہی خراب ہے۔ اعلیٰ حکام کو دورے پر جانا ہو تو اپنی کاروں میں جاتے ہیں۔ ان پر راستہ کی خستہ حالت کا کوئی خاص اثر نہیں پڑتا۔ اسی لیے ناواقفیت کا بہانہ کرتے ہیں۔ اور سڑک کی درستگی کی طرف کوئی دھیان نہیں دیتے

یہ ضلع اپنے جنگلات کے لیے مشہور ہے۔ حالانکہ اب پہلے جیسے جنگل نہیں رہے۔ پھر بھی علاقہ میں سب سے زیادہ جنگلات یہیں ہیں اور ان ہی جنگلات کی وجہ سے یہ علاقہ بدنام بھی بہت ہے۔ نکسلائٹ سرگرمیوں کا گڑھ ہے یہ ۔۔۔ ڈاکوؤں کی

بھی بڑی بڑی پناہ گاہیں یہاں ہیں۔ ملازمت کے لیے کوئی دوسرے علاقوں سے ادھر آنا پسند نہیں کرتا۔ کہا جاتا ہے کہ کوئی ماتحت جب کسی افسر اعلیٰ کے عتاب کا شکار ہوتا ہے تو۔۔۔ اس کا تبادلہ اس علاقے میں کر دیا جاتا ہے۔

محکمۂ جنگلات کے تبادلے البتہ اس بات سے مستثنیٰ ہیں۔ دوران ملازمت ہر افسر کو کچھ عرصہ اس علاقے میں رہنا پڑتا ہے۔ یہاں نے بازی نہیں چلتی۔ یہاں کے جنگلات ان کے جنگلات سے متعلق علم میں بھرپور اضافہ کرتے ہیں۔

قدرتی مناظر یہاں کے لاجواب ہیں۔ اس ڈاک بنگلے ہی کو لیں جہاں نوین اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ ٹھہرا ہوا ہے۔ سو برس قبل یہ بنگلہ ضلع کلکٹر کی اقامت گاہ ہوا کرتا تھا۔ کچھ بھی کہئے۔ انگریزوں کے قدرت سے لگاؤ اور دور اندیشی پر شک نہیں کیا جا سکتا۔ خوف ناک درندوں سے بھرے گھنے جنگلوں سے گھرے اس مقام کا چناؤ کرنا ان ہی کے دل گردے کی بات تھی۔ ندی کے دلکش منظر کو نظر میں رکھ کر بنگلہ بنانا ان ہی کا کام تھا اور کام بھی کیسا؟ ایک دم پرفیکٹ۔ کیا مجال جو برسوں بعد بھی کہیں سے دراڑ پڑی ہو یا کوئی اینٹ ہی جگہ خالی کر گئی ہو۔ کہیں سیلن رستی ہو یا دھوپ کسی غلط اینگل سے پڑتی ہو۔۔۔ سامنے چٹانوں میں جو کھڑکیاں بنی تھیں، جہاں سے انگریز سپاہی نظام کی فوجوں پر نگاہ رکھتے تھے۔۔۔۔ سب ہی کچھ پکار پکار کر انگریزوں کی دور اندیشی اور قابلیت کی شناخت کراتے تھے۔

انگریز ہندوستان سے گئے تو ضلع کلکٹر کا یہ بنگلہ ڈاک بنگلہ بنا دیا گیا۔ اب اعلیٰ حکام یہاں آ کر ٹھہرتے ہیں اور واپس لوٹ کر اس کی تعریف کرتے نہیں تھکتے۔۔۔۔ سامنے چنچل دوشیزہ سی اٹھلاتی ندی ہے تو دوسری طرف مشنری والوں کا آم، امرود اور کٹھل کے پیڑوں سے گھرا وسیع کمپاؤنڈ ہے۔ برسوں پہلے ان لوگوں نے کئی ایکڑ زمین خرید کر رکھی تھی۔ اسپتال کھولے تھے۔ اسکول کی بنیاد ڈالی تھی۔ اور عیسائی مذہب کی تبلیغ شروع کر دی تھی۔ کامیاب بھی ہوئے تھے ویسے اب تبلیغ کا کام تو چل رہا ہے۔ مگر اتنی کامیابی نہیں ملتی۔ زمانے کے ساتھ یہاں کے باشندے اپنے حقوق اور اپنے استحصال کے تئیں کافی چوکنے رہنے لگے ہیں۔ بھوکے ننگے اب بھی رہتے ہیں مگر اپنے مذہب سے لگاؤ کم نہیں کرتے۔۔۔ اسی لیے اسپتال کی حالت بھی بڑی خستہ ہے گاہکوں کی تعداد میں بھاری کمی ہو جائے تو کوئی بے وقوف ہی ہوگا جو دوکان کھلی رکھے گا۔ آج حالت یہ ہے کہ ڈاکٹر کی عدم موجودگی

میں اسپتال نرسوں کے رحم وکرم پر چل رہا ہے۔ قیمتی ایکرے مشینوں کو آپریٹ کرنے والا کوئی نہیں اور لاکھوں روپے کی غیر ملکی قیمتی دوائیاں پڑی سڑ رہی ہیں۔

ڈاک بنگلے کے دوسری طرف پیران پیر کی درگاہ ہے۔ یہاں بھی آج کل باجماعت نماز ہوتی ہے۔

یہ غروب آفتاب کا وقت تھا۔ آفتاب نے دیران ہنا کے پانی کو سرخ کر دیا تھا۔ بے حد دلفریب منظر تھا۔ نوین سحر زدہ سا دیکھتا رہا بے اختیار اس کا جی چاہا کہ شیلو اور بچوں کو بھی اس دل فریب منظر کا نظارہ کرائے۔ اس نے پیچھے مڑ کر آواز دی "شیلو، بچوں کو لے کر باہر آجاؤ.."

شیلو باہر نہیں آئی۔ بچے البتہ یوں دوڑے جیسے ماں کے پیار سے بندھن سے آزاد ہونے کے لیے باپ کی اس پکار کے منتظر ہوں۔ نوین نے شامی اور ٹنکو کو دریا کا حسین نظارہ دکھاتے ہوئے کہا۔ "وہ دیکھو۔ ندی کی اس طرف ہم ہمارا انشٹر بھی ہین اور ندی کے اس پار آندھرا پردیش کی سرحد شروع ہو جاتی ہے۔ وہ لہلہاتی فصلیں جو تم دیکھ رہے ہو وہ آندھرا کے باسیوں کی ہیں.."

نوین بچوں سے ضرور مخاطب تھا مگر اس کا دھیان شیلو کی بے اعتنائی کی طرف تھا۔ شیلو کتنی بدل گئی ہے آج کل۔

"پاپا، ہمارا بھارت ایک کیوں نہیں ہے؟ کیوں اتنے ٹکڑوں میں تقسیم ہے؟ کیوں ہندوستانی اتنے جھگڑے کرتے ہیں؟ کبھی مذہب کے نام پر، کبھی زبان کے مسئلے پر...."

کہتے کہتے شامی خاموش ہو جاتی ہے شاید جو کچھ اس نے پڑھا سنا تھا اس میں سے اتنا ہی یاد رہ گیا تھا۔ بچے بعض اوقات اپنے معصوم سوالات سے بڑوں کی زبان بند کر دیتے ہیں مگر اسی وقت خانساماں آگیا اور نوین جواب کا گووردھن پربت اٹھانے سے بچ گیا۔ وہ چائے کے لیے پوچھنے آیا تھا مگر نوین کا جی نہیں چاہ رہا تھا۔ اس نے منع کر دیا۔ وہ لگاتار شیلو کے بدلتے ہوئے مزاج کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ شیلو کی بے اعتنائی میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ وہ آج کل نوین کو نظر انداز کرنے لگی ہے۔ زندگی میں تمام تر کشش کا مرکز اس کے لیے اس کے بچے ہو گئے ہیں۔ نوین بارہا سوچتا کہ ابھی شادی کو دس برس ہی ہوئے ہیں اور شیلو شادی شدہ زندگی کا سارا چارم کھو بیٹھی ہے تو بقیہ زندگی کس

طرح گذرے گی۔۔۔۔ نہیں چارم کھو دینے کا الزام غلط ہو گا۔ زیادتی ہوگی شیلو کے ساتھ ۔۔۔۔ ہاں یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ شیلو شریک حیات کے فرائض سے زیادہ ماں کی ذمہ داریوں کو اہمیت دینے لگی ہے۔

بیوی بن کر عورت چاہے تمام حقوق حاصل کر لیتی ہو مگر پھر وہ محبوبہ نہیں رہ جاتی۔ جس طرح امتحان میں کامیابی حاصل کرنے کی غرض سے مطالعہ کرنے والا طالب علم امتحان ہوتے ہی سب علم فراموش کر دیتا ہے اسی طرح ازدواجی زندگی قائم ہوتے ہی محبوبہ محبت کی باتیں کرنا بھول جاتی ہے۔ شیلو سے نوین کی ملاقات کالج کے دنوں میں ہوئی تھی کالج میں خالی اوقات میں وہ گھنٹوں بیٹھے گپ شپ کرتے رہتے۔ موضوع کوئی بھی ہوتا اہم ہوتا ان کا باتیں کرنا اور ان باتوں کے ذریعے ایک دوسرے کا قرب پانا۔ پھر بھلے ہی وہ نوین کا چھیڑا ہوا سیاست کا کوئی گرما گرم موضوع ہوتا یا شیلو کا پیش کردہ کسی فلمی اداکارہ یا اداکار کی دوسری تیسری شادی کی چٹپٹی خبر یا کسی ہم جماعت کا برائی پران ۔۔۔۔ شیلو کو باتیں کرنے کا بے حد شوق تھا اور نوین کو شیلو کے بات کرنے کا انداز بے حد پسند تھا۔ پھر بھلا شیلو کو بات کرنے سے کون روک سکتا تھا۔

بات کرتے وقت وہ دھلی دھلی، نئی نئی، نکھری نکھری سی لگتی۔ جوش میں ہونٹوں کا کونہ دبا لینے کی اس کی ادا پر تو نوین ہزار جان سے فدا تھا۔۔۔۔ تجسس اور فرط حیرت سے اس کا مٹھی باندھ لینا اور آنکھیں پھیلانا سب کچھ نوین کو پیارا لگتا۔ جوش اور جھنجلاہٹ میں اس کی ستواں ناک پر پسینے کی ننھی ننھی بوندیں چمکنے لگتیں۔ ان موتیوں کو اپنے ہونٹوں سے بے ساختہ چن لینے کی خواہش کو اسے جبراً روک لینا پڑتا۔

بات کرنے کی شیلو کی عادت اب بھی ویسی ہی ہے۔ فرق صرف یہ ہوا ہے کہ گفتگو تمام موضوع بچوں تک محدود ہو کر رہ گئے ہیں۔ نوین پیار بھری باتیں کرنا چاہتا ہے۔ رومانٹک موڈ میں ہوتا ہے وہ بچوں کی اسکول کی رپورٹ سنانے بیٹھ جاتی ہے یا ان کے مستقبل کے پلان مرتب کرنے لگتی ہے۔ جیسے منکو کے ذخیرۂ الفاظ میں نئے الفاظ کا اسٹاک جمع ہوا ہے۔ شامی اب ڈانس کے سات اسٹیپ کر لیتی ہے۔۔۔۔ منکو کو کیا بنائیں گے وہ انجینیر بننا چاہتا ہے۔ ہم اسے ڈاکٹر بنانا چاہتے ہیں۔ اس کی دلہن کیسی لائیں گے ؟ گوری اونچی یا سانولی سلونی بوٹے سے قد والی۔۔۔۔ شامی کا دولہا کون پسند کرے گا۔۔۔

وہ خود باہم ۔۔۔۔ نوین کو حیرت ہوتی کہ شیلو بیس برس بعد کی باتیں سوچ سکتی ہے مگر فی الحال شوہر پر کیا بیت رہی ہے یہ سوچنے کا اسے وقت نہیں ہے یا فرصت نہیں ہے۔ کیسی بیوی ہے یہ!

کیسا رومانٹک منظر تھا۔ شیلو یہاں آ کر اس کے نزدیک کھڑی ہوتی تو وہ اپنی شادی کے بعد کے ابتدائی دنوں کی یاد تازہ نہ کرتا؟ مانا کہ بچّوں کی موجودگی میں وہ بے صبری کا مظاہرہ نہ کرتا مگر آنکھیں اسی وقت تو بولتی ہیں جب ہونٹ معذوری ظاہر کرتے ہیں۔ ہندی شاعر کے مطابق "موک (خاموشی) سب سے بڑی آواز" کو دھیان میں رکھ کر نوین اپنے دل کی بات کو آنکھوں ہی آنکھوں میں شیلو تک پہنچا دیتا۔

ندی سوکھی ہو تو کناروں کے فاصلے اور بڑھ جاتے ہیں۔ ہلوریں لیتا پانی کناروں کو چھو کر فاصلہ کم کرتا ہے۔ قرب کا احساس بڑھاتا ہے جینے کی امنگ پیدا ہوتی ہے۔ مگر شامی اور منکو کے ہونے کے باوجود ان کے درمیان کے فاصلے مسلسل بڑھتے جا رہے تھے۔

نوین پھر ماضی کی حسین یادوں کی وادیوں میں جا پہنچا۔ شیلو سے ملاقاتیں بڑھیں تو نوین کو اس کے بغیر زندگی ادھوری معلوم ہونے لگی۔ ایک دن اس نے حوصلہ کر کے شیلو سے کہا تھا! "کل اپنے ماتا پتا کو تمہارے گھر بھیج رہا ہوں۔"

"کس لیے؟" تجاہل عارفانہ سے شیلو نے پوچھا تھا۔

"میں تمہیں پسند کرتا ہوں۔ تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں"

"مگر میں تو تمہیں پسند نہیں کرتی" شیلو یکایک سنجیدہ ہو گئی تھی۔

"کیا، کیا کہہ رہی ہو تم؟" نوین پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔

"میرا مطلب ہے۔۔۔۔ دوست کی حیثیت سے تم مجھے پسند ہو۔ تمہارے ساتھ اٹھتی بیٹھتی ہوں، گھومتی پھرتی ہوں، اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ شریک حیات کے طور پر بھی تمہیں ہی منتخب کر لوں"

"بہت اچھے" نوین طنز سے مسکرایا تھا" دانہ پھیلاتی ہو اور چاہتی ہو کہ پرندے نہ آئیں۔ مجھے اپنی محبت کے جال میں پھنسا کر تڑپا رہی ہو۔ یاد رہے میں جال لے کر اڑ جانے کی طاقت رکھتا ہوں۔ مگر یہ بھی یاد رکھو کہ تم نہ چاہو گی تو یہ جرأت کبھی نہ کروں گا۔ میں اپنے

مانا پنا کو بھیجوں گا ضرور۔ تم بھلے ہی انکار کر دینا۔"

نوین کی بات گئی تھی اور رکھ لی گئی تھی۔ منھ میٹھا کر کے ہی آئے تھے وہ لوگ۔ نوین نے فوراً شیلو کو کالج کے لائن میں جا گھیرا تھا۔ "شیلو ۔۔۔۔ اچھی شیلو"۔ وہ وفورِ جذبات سے بے قابو ہو کر بولا تھا۔ "تم نے تو کل میری جان ہی نکال لی تھی۔ میں رات بھر کروٹیں بدلتا رہا۔ سو یا نہیں ایک لمحے کو بھی۔ تم نے وہ بات کیوں کہی تھی شیلو؟ کیا میرا امتحان لینا مقصود تھا۔

"تم کیا سچ سمجھ بیٹھے تھے؟ میں مذاق کر رہی تھی۔ میں ان لڑکیوں میں سے نہیں جو بیسر سپاٹے کرتی ہیں ایک ساتھ اور شادی رچاتی ہیں دوسرے کے ساتھ۔" وہ ہنستی ہوئی بولی تھی۔

ایسی تھی شیلو تب۔ نوین کی فلاسفی کے مطابق اچھے کو ہمیشہ اچھے ہی رہنا چاہیے، چاہے کتنے ہی خراب حالات کیوں نہ ہوں۔ عورت کا مُنا کا دوسرا نام ہے۔ وقتاً فوقتاً اسے بیٹی بہن، بیوی اور ماں کے کردار نبھانے پڑتے ہیں کسی اور کردار کو خوش اسلوبی سے ادا کرتے ہوئے دوسرے کردار کو گزند نہ پہنچے، دوسرے کردار کا تصوف۔ بالا پیج داغدار نہ ہو اس کا خیال رکھنا عورت کے لیے ضروری ہوتا ہے۔

"شامی ٹنکو ۔۔۔۔ سردی بڑھ گئی ہے۔" شیلو باہر آئی۔ بچوں کو سویٹر پہنایا اور اندر کھینچ لے گئی۔ نوین زخم خوردہ نظروں سے اسے دیکھتا رہ گیا۔

رات کو ڈنر لیتے ہوئے شیلو خانساماں سے پوچھ بیٹھی۔ "ہم نے سنا ہے کہ اس ڈاک بنگلے میں کچھ ہے؟"

شامی اور ٹنکو کھانا کھا کے سو چکے تھے۔ شیلو نے موزوں وقت دیکھ کر بات چھیڑی تھی۔ وہ آئی ہی تھی اس کچھ کی کھوج میں۔

نوین کو اکثر ہی دورے پر اس علاقے میں آنا پڑتا تھا۔ کئی مرتبہ اس نے یہاں کے قدرتی مناظر کی تعریف کر کے شیلو کو اپنے ساتھ لے جانا چاہا تھا مگر شیلو ٹال گئی تھی۔ کبھی اپنی اور کبھی بچوں کی خرابی صحت کا بہانہ کر کے۔ یہ وہی شیلو تھی جو شادی کے بعد سے شامی کی پیدائش تک ہر جگہ نوین کے ساتھ جاتی تھی۔ کہیں نوین ۔۔۔ ساتھ نہ لے جاتا تو دونوں ہفتوں اس سے منھ پھلائے رہتی تھی۔

ایک دن لیڈیز کلب کی میٹنگ سے لوٹ کر اس نے پوچھا تھا۔ "اس بار تمہارا

ٹور کب ہے؟"

"کیوں، کوئی پارٹی وارٹی رکھنا ہے کیا؟ مجھے بھگانا چاہتی ہو؟" نوین ہلکے پھلکے موڈ میں تھا۔

"میں اس مرتبہ ساتھ چلوں گی۔ یعنی ہم سب ساتھ چلیں گے" شیلو نے اعلان کیا تھا "آج لیڈیز کلب میں بات ہو رہی تھی کہ وہاں کے ڈاک بنگلے میں ایک آتما گھومتی ہے۔ کہتے ہیں کہ کئی سو سال پہلے ایک انگریز کلکٹر نے اپنی بیوی کو ایک ڈپٹی کلکٹر کے ساتھ ناجائز تعلقات رکھنے کا گنہگار پاکر شوٹ کر دیا تھا۔ اسی فرنگن کی آتما گھومتی ہے وہاں۔"

"تو تم اس مقام کو دیکھنا چاہتی ہو جہاں کلکٹر نے اپنی وائف کو شوٹ کیا تھا؟"

"نہیں، آتما دیکھنا چاہتی ہوں۔" شیلو نے اشتیاق سے کہا تھا۔

نوین کو بے ساختہ ہنسی آگئی تھی۔ لمحہ بھر کے لیے اس کا جی چاہا تھا کہ وہی گھسا پٹا طنز کر دے شیلو پر کہ کیوں بھئی اپنے والوں سے ملنے کو جی چاہ رہا ہے کیا؟ یا کہے کہ... تم جاؤ گی تو وہ کہاں رہے گی؟ ایک میان میں دو تلواریں سمائی ہیں کبھی؟ اسے ہی رہنے دو۔ کیوں بے چاری کا گھر اجاڑتی ہو؟ مگر نوین نے کچھ کہا نہیں۔ وہ شیلو کے غصے سے ڈرتا تھا۔ شیلو چاہے خود دوسروں سے مذاق کر لے۔ دوسروں پر طعنہ زنی کرے مگر خود طنز و مزاح کا مرکز بن جائے تو ہنسنے سے اکھڑ جاتی ہے۔

"کیا یہاں سچ مچ کچھ ہے؟" وہ خانساماں سے حقیقت جاننا چاہتی تھی جس سے واپس لوٹ کر لیڈیز کلب کی ممبران پر اپنی معلومات کا رعب ڈال سکے۔

"کہاں بائی صاحب!" خانساماں نے پلیٹیں اٹھاتے ہوئے کہا۔ "افواہ پھیل گئی ہے۔ بس۔ ہم سولہ برسوں سے یہاں کام کر رہے ہیں۔ ہم نے تو یہاں کبھی کچھ نہیں دیکھا۔"

"چوکیدار نے دیکھا ہوگا" شیلو کو اس کے جواب سے اطمینان نہ ہوا۔

"ہم ہی سب کام دیکھتے ہیں۔ ہم خانساماں بھی ہیں اور چوکیدار بھی ہیں۔ رات برات صاحب لوگوں کے آنے پر انہیں کھانا بھی کھلاتے ہیں۔ قسم لے لیجیے۔ جو کبھی کچھ دیکھا ہو۔"

خانساماں برتن اٹھا کر باہر چلا گیا۔ نوین نے دیکھا کہ شیلو کا جوش سرد پڑ گیا تھا مگر وہ جلد ہمت والوں میں سے نہ تھی۔

خانساماں لوٹ کر آیا تو شیلو نے گفتگو کا سلسلہ پھر سے جوڑتے ہوئے کہا۔ "کچھ بھی

نہیں ہے یہاں تو ساری باتیں یکسے پھیل گئیں، ابھی گذشتہ ماہ ہی تو ایک صاحب کا قصہ کافی مشہور ہوا تھا۔"

"ارے واہ" خانساماں ہنس دیا۔ پھر نوین کی طرف دیکھ کر بولا "معاف کیجئے صاحب کبھی کبھی مرد عورتوں کے مقابلے میں زیادہ بزدلی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ وہ صاحب یہاں پہلی مرتبہ آئے تھے۔ رات کو ڈرائنگ روم میں یہی بات بحث کا موضوع بن گئی۔ کسی نے کہہ دیا،" وہی تو بھوتوں والا کمرہ ہے جس میں آپ ٹھہرے ہوئے ہیں۔"

وہ صاحب ڈر گئے۔ رات کو اس کمرے میں گئے ہی نہیں۔ کھانے کی میز پر بستر لگایا سویرے نہانے کے لیے انہیں اپنے کمرے کے غسل خانے میں جانا پڑا۔ نہ جانے کیا ہوا کہ چیختے چلاتے، صرف زیر جامے میں باہر آگئے۔ جسم پر صابن لگا ہوا تھا۔ . . غسل خانے سے جو باہر نکلے تو نیچے سڑک پر پہنچ کر دم لیا۔ لوگوں نے سنبھالا، پوچھا، کیسا تھا بھوت . . تو بولے، "چولی گھاگھرا پہنے، پائل بجاتی ہوئی ایک عورت کو دیکھا اور بھاگ کھڑا ہوا ہیں۔"

" واہ!" نوین بے ساختہ ہنس کر بولا " انگریزی میم صاحب کی روح، گھاگھرا چولی میں!"

"چپ بھی رہو، مذاق نہ کرو" شیلو نے نوین کو گھورا۔

" نہیں بائی صاحب! صحیح بات پکڑی صاحب نے!" خانساماں نے نوین کی تائید کی. . . . " اس روز وہاں موجود سب ہی لوگوں نے ان صاحب کی ہنسی اڑائی کہ میم صاحب کی آتما کو تو اسکرٹ بلاؤز میں ہونا چاہئے۔

کیا وقت اور زمانہ کے ساتھ آتمائیں بھی فیشن بدلتی ہیں؟"

یہ بات کہی تم نے!" نوین نے تعریفی نگاہوں سے خانساماں کو دیکھا۔ " تم بڑے عقلمند ہو۔ آتما، واتما کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔ انسان ذہن کی کمزوری ہی اس کے خوف کو وجود عطا کرتی ہے۔ خوف دل کی کمزوری کا دوسرا نام ہے۔"

" شکریہ صاحب" خانساماں نے نوین کے تعریفی کلمات سے مسرور ہوتے ہوئے کہا۔

" اب دیکھیے نا۔ لوگوں کو حقیقت سے واقف کرانے جاؤ تو ماننے کو تیار نہیں ہوتے کہتے ہیں رات کو پھٹ پھٹ کی آواز آتی ہے۔ یہاں کی چھپکلیاں دیکھیں آپ نے صاحب!"

اچانک خانساماں نے موضوع بدل کر دریافت کیا۔

"چھپکلیاں؟" شیلو کو خوف سے جھرجھری آگئی۔

"ہاں دیکھی ہیں۔" نوین نے بے پروائی سے بولا۔ "عام چھپکلیوں سے تین گنا بڑی ہیں۔

"یہ چھپکلیاں رات کو کیڑے پتنگے کھانے کے لیے نیچے اتر آتی ہیں۔ خاص بات ان کی یہ ہے کہ چلتی نہیں چھلانگیں لگاتی ہیں تو پھٹ پھٹ کی آواز آتی ہے جیسے ڈاک بنگلے ڈاک رہنے والے سنتے ہیں۔ تصور آنکھوں کے سامنے کوئی شکل کھڑی کر دیتا ہے اور وہ چلاتے ہیں بھوت بھوت......"

"مطلب یہ کہ کوئی اسکرٹ بلاؤز والی آتما کو دیکھنے کی خواہش رکھتا ہو تو آتما بار روح اسے اسی لباس میں دکھائی دے گی؟"

"اور کیا؟" اچانک خانساماں کی نظر شیلو کے سفید ہوتے چہرے پر پڑ گئی۔

"کیا ہوا بائی صاحب آپ کو؟ سچ کہہ رہا ہوں۔ کوئی بھوت نہیں ہے یہاں۔"

"یہ چھپکلیاں!" شیلو خوف سے کانپتی ہوئی بولی۔ "چھپکلیاں کمرے میں تو نہیں آتیں ——؟"

"چھپکلیوں سے اپنے ڈر کی وجہ سے تم کوئی ہنگامہ نہ کھڑا کر دینا ورنہ مستقبل میں تمہارا قصہ بھی دوسروں کو سنایا جائے گا۔" نوین نے مسکرا کر شیلو کو تنبیہ کی۔

"کمال کی بات ہے صاحب" خانساماں حیرت سے بولا "جتنی بھی بائی صاحب لوگ آتی ہیں وہ روح سے اتنا نہیں ڈرتیں جتنا چھپکلیوں سے خوف کھاتی ہیں۔"

نوین نے دل میں کہا۔ "ہاں عورتیں کسی سے، یہاں تک کہ شوہروں سے بھی نہیں ڈرتیں لیکن چھپکلیوں سے ڈرتی ہیں۔" مگر ظاہر میں کہا "چھپکلیاں درحقیقت بڑی خوف ناک ہیں، ایر گن سے ختم کیوں نہیں کر دیتے؟"

نوین پہلے بھی کئی مرتبہ یہاں آیا تھا مگر ایک نظر ان چھپکلیوں کی طرف ڈالنے کے بعد دوسری مرتبہ نہیں دیکھا تھا۔ ویسے بھی وہ نیچے دیکھ کر چلتا تھا۔ چھت پر کی چھپکلیاں نہیں گنتا تھا۔ اس مرتبہ جو توجہ دے رہا تھا تو صرف شیلو کی خاطر۔

"کیا بگاڑتی ہیں بے چاری، الٹے کیڑے مکوڑوں سے ہماری حفاظت کرتی ہیں۔" پھر خانساماں شیلو سے مخاطب ہو کر بولا۔ "ڈرتے نہیں بائی صاحب۔ چھپکلیاں اندر نہیں آتیں۔"

شیلو پھر بھی سہمی ہوئی تھی۔ رات کو سونے سے پہلے اس نے کمرے کا کونہ کونہ دیکھ ڈالا کہ کہیں کوئی چھپکلی تو نہیں ہے۔ سب طرف سے اطمینان کر لینے کے بعد ہی وہ سوئی۔ اس کی بدحواسی دیکھ کر نوین نے سوچا۔ "کتنا آسان طریقہ ہے ان چاہی بیوی سے چھٹکارا پانے کا۔ غیر ملکی جاسوسی کہانیوں اور ناولوں میں وہ پڑھتا رہا ہے کہ کسی دوسری عورت سے شادی کرنے کے لیے۔ یا بیوی کی دولت ہتھیانے کے لیے مجرمانہ ذہنیت کے شوہر اپنی بیوی کو ختم کرنے کے ایسے طریقے اپناتے ہیں جس سے فطری موت کا گمان گذرے۔ وہ کبھی شیلو سے نجات حاصل کرنا چاہے گا تو دو موٹی موٹی چھپکلیاں پکڑ کر اس کے اوپر ڈال دے گا۔ وہیں اسی وقت اس کے دل کی دھڑکن رک جائے گی۔

"ممی .... دیکھو .... منکو .... گیندلا ...." شامی نیند میں بڑبڑائی۔ نوین نے چونک کر اسے تھپکی دی۔ خود بھی جیسے ہوش میں آگیا۔ یہ کیا اناپ شناپ سوچنے لگا ہے۔ وہ شیلو اس کے بچوں کی ماں ہے۔ وہ اپنے بچوں کو ممتا سے محروم کر دینے کی سوچ رہا ہے اسے خود پر جھنجلاہٹ ہوئی ... ایسے بے کار خیالات دوبارہ اس پر حاوی ہوں اس سے پہلے اس نے خود کو نیند کے حوالے کر دینا بہتر سمجھا۔ کروٹ بدلی اور آنکھیں بند کر کے لیٹ گیا۔

بہت تڑکے نوین کی آنکھ کھل گئی۔ شیلو کی طرف اس نے دیکھا۔ شامی اور منکو کو اپنے دونوں طرف سلائے خود بھی گہری نیند میں سوئی ہوئی تھی ...

"ہنھ! دعوے تھے بھوت دیکھنے کے" نوین مسکرا اٹھا۔ ادھر نیند کا یہ عالم ہے کہ بھوت پلنگ اٹھا کر چل بھی دے تو خبر نہ ہوگی۔

نوین اٹھ کر ڈریسنگ گاؤن پہنتا ہوا ٹیرس پر آگیا۔ کرنیں سورج دیوتا کے آنے کی اطلاع دینے چل پڑی تھیں پرندے چہچہا رہے تھے۔ بادِ صبح دیپرا ن ہنا کے پانی کو ہلکی ہلکی تھپکیاں دے کر بیدار کر رہی تھی۔ ماحول پر نشہ طاری کر دینے والی مدہوشی چھائی ہوئی تھی وہ چھوٹے چھوٹے پتھروں پر پاؤں جماتا ہوا نیچے اتر گیا۔ گھاٹ پہ پہنچ کر دیر تک ملاحوں اور مسافروں کی آمد و رفت دیکھتا رہا۔ سویرے کی ٹھنڈی اور خوشگوار ہوا سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ آندھرا پردیش سے شمالی ہندوستان میں پہنچنے کے لیے ادھر کا راستہ بہت مناسب ہے۔ ناؤ میں پران ہنا پار کر کے سرونچا آگئے۔ سرونچا سے منچریال کا

راستہ بس سے طے کیا۔ یہاں سے ریل سیدھی ناگپور جاتی ہے۔ وہاں سے دلی جموں جو جانا چاہے چلا جائے۔

جی بھر کر گھوم لینے کے بعد نوین ڈاک بنگلے واپس پہنچا۔ نیلو ناشتے پر اس کا انتظار کر رہی تھی۔ ناشتہ کر کے وہ سوم نور کی طرف چل دیے۔

اس علاقے میں اکا دکا ماڑیا آدمی واسی دکھائے دئے جاتے ہیں۔ ویسے وہ گھنے جنگلوں میں بستیاں بنا کر رہتے ہیں۔ بستر کے آدی واسیوں سے ملتا جلتا رہن سہن ہے ان کا۔ عورت مرد کے لباس میں یکسانیت ہوتی ہے گھٹنوں سے اوپر سفید دھوتی۔ اور اوپر کا بدن عریاں۔ عورتیں برہنہ رہنے میں شرم محسوس نہیں کرتیں۔ اپنی بستی میں اپنے لوگوں میں وہ بے جھجک برہنہ گھومتی ہیں۔ لیکن اپنی بستی سے نکل کر جب شہری بستیوں کی طرف آتی ہیں تو شہریوں کی بھوکی نظروں سے بچنے کے لیے دھوتی کو آنچل کی طرح سینے پر ڈال لیتی ہیں۔ آدی واسی عورتیں قدیم روایتی گودنوں کی شوقین ہوتی ہیں۔

نوین وغیرہ راستے میں ایک جگہ چائے پینے رکے تھے۔ وہاں ایک ماڑیا عورت کا گودنوں سے بھرا چہرہ دیکھ کر نامی بے حد حیران ہوئی تھی۔ اس کی نظر وہاں سے ہٹتی ہی نہ تھی۔

نامی گودنے دیکھنے میں گم تھی تو ٹنکو درختوں پر سے تاڑی اتارتے ہوئے آدی واسیوں سے دیکھ رہا تھا۔ "پاپا ہماری طرف تو مزدور تاڑ کے درخت پر چڑھ کر تاڑی اتارتے ہیں۔ یہ آدی واسی کیوں سیڑھی سے چڑھ رہے ہیں۔"؟

آدی واسی تاڑ کے سیدھے سپاٹ اونچے تنے پر چڑھنے کے فن سے ناواقف ہوتے ہیں۔ وہ بانسوں کو جوڑ کر سیڑھی بناتے ہیں اس میں سے عام سیڑھیوں جیسے خانے نہیں ہوتے۔ بانس کی زائد ٹہنیاں کاٹتے وقت بالشت بھر کے ٹکڑے کاٹنے سے چھوڑ دیے جاتے ہیں۔ پھر دو تین لمبے بانسوں کو جوڑ کر درخت کے ساتھ سہارا دے کر کھڑا کر دیا جاتا ہے۔ ان ٹکڑوں پر پاؤں جما کر آدی واسی اوپر چڑھتے ہیں۔

ٹنکو کی باریک بینی سے نوین کو بے حد خوشی ہوئی۔ اس نے کہا۔۔۔ "ہمارے یہاں تاڑی جمع کرنے کا کام کیرل کے رہنے والے مزدور کرتے ہیں جنہیں ناریل کے پیڑ پر چڑھنے کی مشق ہوتی ہے۔ اس مخصوص طریقے سے پیڑ پر چڑھنے کے لیے کچی عمر سے، جب ہڈیاں نازک

اور لچکیلی ہوتی ہیں، مشق کرنی پڑتی ہے۔ تاڑی کے ٹھیکدار ان کیرل والوں کو ملازم رکھ کر ان سے تاڑی جمع کرواتے ہیں۔ ،، نوین کہتے کہتے رک گیا پھر بولا۔

،، تاڑی آدی واسیوں کا خاص مشروب ہے۔ ویسے یہ ان کی غذا اور مشروب دونوں ہے۔ چالیس فی صد آدی واسی صرف تاڑی پر گذارا کرتے ہیں۔ جو کچھ خوش حال ہیں وہ مڑیا پیتے ہیں۔ مڑیا، چاول میں نمک ڈال کر بنایا گیا گاڑھا مشروب ہوتا ہے جسے آدی واسی تونبی یا کھوکھلے بانسوں میں بھر کر کام پر جاتے وقت ساتھ لے جاتے ہیں اور واپسی پر ان تونبیوں میں تاڑی بھر لاتے ہیں۔ ٹنکو نے یہ سب بہت دلچسپی سے سُنا۔

سوم نور پہنچتے پہنچتے دس بج گئے تھے۔ ریت گرم ہونا شروع ہو گئی تھی۔ نزدیکی سٹم پر پہنچنے کے لیے ریت میں کچھ دور تک پیدل چلنا تھا۔ شامی اور ٹنکو خوشی اور جوش میں آگے آگے بھاگنے لگے۔ شیلو نے انہیں روکنا چاہا تو نوین نے ٹوک دیا۔ ،، جانے بھی دو کیا ہر دم ٹوکتی رہتی ہو۔ ،، شیلو ٹھٹک کر آگے بڑھ گئی مگر تھوڑی ہی دیر بعد اسے رکنا پڑا۔

شیلو کو ریت پر چلنے میں مشکل پیش آرہی تھی۔ اس کی چپل بار بار ریت میں دھنس جاتی۔ نوین سہارا دیتا تب کہیں وہ اپنا پاؤں کھینچ کر آگے بڑھ پاتی۔ ڈرائیور کھانے کی سامان کی باسکٹ لیے کافی فاصلے سے ان کے پیچھے آرہا تھا۔

نوین چپکے چپکے شیلو کو نکسلائٹ سرگرمیوں کے بارے میں بتانے لگا کہ کس طرح نیپن بارڈر کا علاقہ ان کے لیے بہتر بن پناہ گاہ ثابت ہوتا آرہا ہے۔ اچانک ٹنکو جو نہ جانے کب ان کے قریب آگیا تھا، پوچھ بیٹھا ،، پاپا! نکسلائٹ کون ہوتے ہیں؟ ،،

نوین کی سمجھ میں نہ آیا کہ فوری کیا جواب دے۔ بہت سوچ سوچ کر اس نے اٹکتے ہوئے کہا۔ ،، دیکھو بیٹے، کچھ لوگ، امیر بہت امیر ہوتے ہیں۔ کچھ لوگ غریب بہت غریب ہوتے۔ نکسلائٹ امیر غریب کے درمیان کا یہ فرق مٹا دینا چاہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ وہ امیروں کی زائد دولت چھین کر غریبوں میں تقسیم کر دینا چاہتے ہیں۔

،، یہ کام وہ چھپ چھپ کر کیوں کرتے ہیں؟ ،، شامی کا سوال بھی تیار تھا۔ وہ اور ٹنکو ہر بات میں ایک دوسرے کی نقل کرتے تھے۔ نوین شاید اس سوال کا جواب دینے میں کامیاب نہ ہو۔ اس اندیشے سے شیلو نے ٹنکو کو دوسری طرف الجھا لیا۔ نوین ابل کر رہ گیا شیلو آج کل اسی طرح نوین کو ،انڈر ایسٹی میٹ، کرنے لگی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ شیلو کے

بحث چھڑ جانے پر نوین اکثر خاموشی اختیار کر لیتا ہے۔ لیکن خاموشی، نادان کا نہیں دانا کا ہتھیار ہے۔ شیلو اسے نہیں سمجھتی تھی۔ خود چاہے تمام دن بچوں کے اوٹ پٹانگ سوالات کے جوابات دیتی رہے گی، جہاں بچوں نے نوین سے کچھ پوچھا، کہتی ہے کیا تمہارے پاپا کو سب کچھ معلوم رہتا ہے؟ انہیں نہ ستاؤ مجھ سے کہو کیا کہنا ہے؟

عورت محبت کے معاملے میں بڑی تنگ دل ہوتی ہے۔ جب تک وہ محبت سے انکار کرے تب تک ہی ٹھیک رہتی ہے۔ ایک مرتبہ پریم بندھن قبول کر لینے کے بعد وہ شوہر کو بچوں کے باپ کے درجے پر فائز کر کے شوہر کے حقوق سے بڑی حد تک محروم کر دیتی ہے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کے لیے بچوں کو اپنی ذات پر منحصر کر کے اپنے وجود سے باندھے رکھتی ہے۔ وہ ہمیشہ مرکز میں رہنا چاہتی ہے۔ محبت پانے میں بھی اور محبت بانٹنے میں بھی۔ شیلو کا سلوک نوین کے اس خیال کی پختگی کا باعث ہوا تھا۔

سومنور سے نوین کا موڈ جو بگڑا تو پھر اس نے کسی بات میں دلچسپی نہ لی۔ اس نے بھی تہیہ کر لیا تھا کہ شیلو اسے نظر انداز کر سکتی ہے تو وہ بھی کیوں پرواہ کرے اس کی؟ وہ بھی اپنے آپ کو مشغول رکھ سکتا ہے۔ کھنچ تو اتنی بڑھے گی جتنا اس کا احساس کیا جائے گا۔

گھر لوٹ کر بھی اس کا موڈ بگڑا رہا۔ نہ جانے یہ کبیدہ ماحول کتنے دنوں بنا رہتا اگر نشامی کی سالگرہ درمیان میں نہ آ گئی ہوتی۔ ایک بیٹی تھی ان کے یہاں۔ اس کی سالگرہ پر بھی ماں باپ منھ پھلائے رہتے تو کیا مناسب ہوتا؟ یہی سوچ کر نوین نے شیلو کو منا لینے کی غرض سے بلا ہی تھا کہ نشامی کے رونے کی آواز آئی۔

"نشامی بیٹی ادھر آؤ، میرے پاس" نشامی کا ذرا سا دکھ، ذراسی تکلیف نوین سے برداشت نہیں ہوتی۔ اٹھ کر وہ جانا نہیں چاہتا تھا۔ دونوں بھائی بہن کو جھگڑتے دیر لگتی نہ میل کرتے۔

"نشامی.... نشا ملا بیٹی ....." نوین نے دوبارہ آواز دی نوشامی دوڑ کر اس کی گود میں آ بیٹھی اور اس نے روتے ہوئے کہا...."پاپا! منکو نکسلائٹ ہو گیا ہے..."

"ایں!" نوین بھونچکا رہ گیا۔

"ہاں ہاں پاپا" نشامی ہچکیاں لیتی ہوئی بولی۔ "میں اپنی گڑیوں سے کھیل رہی تھی۔ منکو نے ایک گڑیا ملازمہ کی لڑکی کملا کو دے دی۔ بولا تمہارے پاس دو گڑیا کیوں ہے؟ ایک گڑیا کملا کے پاس بھی ہونی چاہیئے.... لے کر میری گڑیا اس کو دے دی۔ اوں.... اوں....."

نوین اور شیلو کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ نوین نے اسے پیار کرتے ہوئے کہا۔ دے دیا منکو نے اچھا کیا۔ ہم تمہیں تمہاری سالگرہ پر ایک اور گڑیا خرید کر لا دیں گے۔ تم اب جاؤ اور کھیلو۔۔

شامی کے جانے کے بعد نوین اور شیلو نے سالگرہ پارٹی کا پروگرام بنایا۔ مہمانوں کی لسٹ تیار کی پھر شیلو نے اپنی ماں کا خط نوین کے سامنے رکھ دیا۔ وہ شاید اب تک اسی مناسب موقع کے انتظار میں تھی۔

"دیکھو نوین ممی نے لکھا ہے کہ میں جلدی پہنچ جاؤں۔ نیلو کی شادی آٹھ تاریخ کو ہونا طے ہوئی ہے۔ میں پہلی تاریخ کو چلی جاتی ہوں "

"ضرور چلی جاؤ۔ میں ریزرویشن کرا دیتا ہوں"۔ نوین نے اخبار اٹھاتے ہوئے کہا۔

"تم کب پہنچو گے؟"

"شادی سے ایک روز قبل۔ سات تاریخ کو"

"نیلو کو کچھ دینا پڑے گا"۔ شیلو نے بات آگے بڑھائی۔

"یقیناً دینا پڑے گا۔ بہن کو تحفہ دینے میں شادی میں"۔ نوین نے رواداری میں کہا۔

"میں اسے سونے کا زیور تحفتاً دینا چاہتی ہوں"۔ شیلو نے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔

نوین اخبار پرے کر کے ایک نظر شیلو پر ڈالی اور کہا "تم دے سکتی ہو تو دو۔ میری حیثیت اتنا قیمتی تحفہ دینے کی نہیں۔۔۔

"میں کہاں سے دوں گی؟ کیا میں ملازمت کرتی ہوں یا میرے نام پر بنک میں روپیہ جمع ہے"

شیلو روہانسی ہو گئی جو اس کے مزاج کے خلاف تھا۔ کب کس ہتھیار کو کام میں لانا چاہیئے۔ یہ شیلو خوب جانتی ہے۔ کہاں حق جتا کر، کہاں عاجزی سے، کہاں رو دھو کر مخالف کو زیر کیا جا سکتا ہے اس سے شیلو خوب واقف ہے۔

نوین نے اخبار میز پر رکھ دیا اور سنبھل کر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "شیلو۔ ہم اتنے زیادہ خوشحال نہیں ہیں کہ کسی کو سونے کا زیور تحفتاً دے سکیں۔۔۔۔ پھر قرض لے کر تحفہ دینا تو میں مناسب نہیں سمجھتا۔"

"نیلو کسی نہیں ہے۔ وہ میری بہن ہے۔ شیلو نے فضول سی دلیل دی مگر نوین نے دوبارہ اخبار اٹھا لیا۔ شیلو وہاں سے گئی نہیں اس کے قریب بیٹھی نوین کی انا کو جگانے کی کوشش کرتی رہی کہ اس کی دونوں بڑی بہنیں نیلو کو سونے کی کنگن اور نیکلس دے رہی ہیں۔ اب اگر شیلو سونے کا زیور نہیں دیتی ہے تو

اس کا تو یاس ہو گئی ہی، نوین کا سر بھی نیچا ہو گا۔

نوین سب کچھ سنتا ہوا مونی بابا، بیٹھا رہا۔ چاہتا تو شیلو کے تمام دلائل کا جواب دے سکتا تھا۔ کہہ سکتا تھا کہ اسے فضول دکھاوا اور بناوٹی پن پسند نہیں ہے وہ حال کے ساتھ مستقبل پر بھی نگاہ رکھتا ہے۔ بچے بڑے ہو رہے ہیں، ان کی ضرورتیں بڑھ رہی ہیں، ان کی پڑھائی کے خرچ میں اضافہ ہو رہا ہے۔۔۔ ایسے میں فضول خرچی کو بڑھاوا نہیں دیا جا سکتا۔۔۔ مگر خاموش رہنا اسے زیادہ مناسب لگتا ہے۔ کیونکہ وہ شیلو کے غصے سے ڈرتا ہے۔ غصے میں وہ بالکل بھتنی بن جاتی ہے۔ جیسے جیسے شامی اور ٹنکو بڑے ہو رہے ہیں وہ شیلو کے غصے میں آنے کی وجوہات اور حالات سے سمجھوتہ کرتا جا رہا ہے۔ بچے مقابلتاً بُری عادتیں جلدی سیکھتے ہیں۔ نوین نہیں چاہتا تھا کہ اس کے بچے، بالخصوص شامی اپنی ماں کی طرح غصیل بنے۔ جب بچوں کو وراثت میں کچھ دینا ہی ٹھہرا تو اچھی عادتیں کیوں نہ دی جائیں۔

"کہہ چکیں تم اپنی بات؟ اچھا اب مجھے باہر جانے دو۔ آدھے گھنٹے میں لوٹ کر آتا ہوں" شیلو کی ڈبڈباتی آنکھوں کو نظر انداز کرتا ہوا نوین اٹھ کھڑا ہوا۔

جاتے سے ایک روز قبل شیلو نے کہا "دیکھو، میں نے مسئلے کا حل ڈھونڈ نکالا ہے پیسہ نہ خرچ کرنے کی تمہاری بات بھی رہ جائے گی اور میری سبکی بھی نہ ہو گی۔ ایسا کرتی ہوں کہ میں اپنے پاس سے کوئی زیور دے دیتی ہوں۔"

"کیا مطلب؟ کیا تمہارے پاس زیور زیادہ ہو گئے ہیں؟" نوین نے بے اختیاری چونک کر پوچھا وہ پہلے ہی حیران تھا کہ شیلو نے دوبارہ اس موضوع کو چھیڑا کیوں نہیں ورنہ جس بات کو وہ منوانا چاہتی اٹھتے بیٹھتے اس کا ذکر چھیڑے رہتی۔

"وہ جو لاکٹ والی چین تم نے میرے لیے بنوائی ہے وہی دے دیتی ہوں۔ انگوٹھی کان کے بندے بھی ساتھ میں ہیں۔ نازک مناسبت ہے خوبصورت ہے دینے کے لیے اچھا رہے گا۔"

"شیلو!" نوین زخم خوردہ آواز میں بولا، "ساڑھے تین ہزار کا ہے وہ سیٹ، میرے لیے یہ بہت بڑی رقم ہے، پھر تمہارے لیے کتنے شوق سے بنوایا تھا میں نے۔۔۔" "مجھے پھر کبھی دوسرا بنوا دینا، نہ بنوا سکو تو میں شکایت نہیں کروں گی۔ لینا دینا تو روز ہوتا نہیں۔۔۔ تو پھر دے دوں"

"جب تم دینے کی ٹھان چکی ہو تو مجھ سے پوچھنے کی ضرورت کیا ہے؟" کہہ کر نوین خاموش ہو رہا ہے۔

شیلو گئی تو بچوں کے بغیر سنسان گھر نوین کو کاٹنے لگا۔ شیلو کو نہایت ناراضگی سے اس نے رخصت کیا تھا۔ وہ کئی سالوں بعد مائکے گئی تھی۔ تنہائی میں پہلی مرتبہ نوین کو شیلو کے اور اپنے مزاج کے تجزیے کا موقع ملا۔ رات کو بستر پر کروٹیں بدلتے ہوئے وہ جتنا سوچتا، شیلو کا رویہ اسے غیر مناسب نہ لگتا۔ یہ تو فطری بات نہیں ہے۔ کوئی بھی عورت ماں بننے کے بعد بچوں کی طرف زیادہ توجہ دینے لگتی ہے۔ نوین کون سا نرالا ہی ہے جو بیٹی کی ساری توجہ، سارا دھیان اپنی طرف چاہتا ہے.... پھر وہ حسد کس سے کر رہا ہے اپنے بچوں سے! بچے جب تک چھوٹے ہیں تب ہی تک تو شیلو پورا دھیان ان پر دے گی بچے بڑے ہو جائیں گے تو شیلو پھر اس کے پاس لوٹ نہ آئے گی۔

نوین کو شدت سے احساس ہو رہا تھا کہ بلا وجہ جھنجلاہٹ اور بے بنیاد رشک نے اسے شیلو کے ساتھ غیر مہذب رویہ اختیار کرنے پر مجبور کیا ہے۔ شیلو کو اس کی بے رخی شادی کے ہنگاموں میں بھی یاد آ رہی ہوگی۔ اس خیال نے اسے اور بھی مضطرب کر دیا۔ وہ شادی سے دو روز پہلے سسرال پہنچ گیا۔

شیلو اسے دیکھ کر کھل اٹھی۔ باہر دوڑی آئی اس کے استقبال کو۔ تمام دن وہ بے حد مسرور رہی۔ شام کو اس نے نوین کو علاحدہ لے جا کر کہا۔ "چلیے ذرا بازار ہو آئیں کل وقت نہ ملے گا۔"

"کیا خریدنا ہے بازار سے؟" نوین نے یوں ہی دریافت کیا۔

"تبلو کو دینے کے لیے ایک انگوٹھی خریدیں گے سات آٹھ سو تک کی، روپے میرے پاس ہیں۔"

"مگر تم وہ لاکٹ والی چین دے رہی تھیں نا؟" نوین نے دھڑکتے دل سے پوچھا تھا۔

"وہ اب نہ دوں گی۔" شیلو نے آگے بڑھ کر نوین کا ہاتھ تھام لیا اور رونے لگی۔ سسکتے ہوئے اس نے نوین کو وہ سب باتیں بتا دیں جو پچھلے تین چار دنوں سے اسے پریشان کر رہی تھیں۔

شیلو کی منجھلی دیدی تین روز پہلے اپنے شوہر کے ساتھ آ گئی تھیں۔ ان تین دنوں میں شیلو نے دیکھا۔ جیجا جی بات بات پر اس کی دیدی کو ذلیل کرتے ہیں اس کی کسی بات کو

درخور اعتنا نہیں سمجھتے۔ دیدی ان کے سایے سے بچتی پھرتی ہیں، مگر خاندانوں میں دکھاوے کے لیے اور پتی کی پوسٹ کا رعب جمانے کے لیے بڑی بڑی باتیں کرتی ہیں، سب کو قیمتی تحایف دیتی ہیں۔

بڑی دیدی تنہا آئی تھیں۔ ان کے شوہر کے لیے سالی کی شادی سے زیادہ اہم بزنس کے اپارٹمنٹ تھے۔ دیدی سے ان کے نہ آنے کی وجہ دریافت کرنے پر وہ تو خاموشی اختیار کر لیتی ہیں۔ ان کا مرجھایا ہوا چہرہ البتہ سب کچھ کہہ دیتا ہے۔ "یہ سب دیکھ کر مجھے احساس ہوا نوین کہ میری خوش قسمتی ہے جو تم مجھے شریک حیات کے روپ میں ملے۔ تم ہمیں۔۔۔ یعنی مجھے، اپنے بچوں کو کتنا چاہتے ہو۔ تم ہمارے لیے کیا کیا نہ کرتے ہو۔۔۔" وہ سسکیاں لیتی رہی "اور میں ہوں کہ تمہارا دیا ہو تحفہ دوسروں کو دینے چلی تھی" نوین کچھ نہ بولا۔ وہ سوچ رہا تھا، سکھ کا پانا یا کھونا ہمارے لیے احساسات کی زیادتی یا کمی پر منحصر ہے۔۔۔ یہ اس کی جذباتیت تو ہے جو اسے اپنے سکھ کے کھو جانے کا احساس دلا رہی تھی۔ ورنہ بنٹو کبھی اس سے دور گئی ہی کب تھی۔

ڈاکٹر مست رام کپور

# بانو سرتاج کی کہانیاں

بانو سرتاج کی کہانیوں کی وشیشتا ہے: لوک شیلی اور آدھونک تکنیک کا ادھ بُھت مشرن۔ ایک طرف وہ لوک کتھا کی پرمپرا کے انوسار انو بھو سمپن کتھا واچک کی بھومیکا اپنا کر آپ بیتی یا جگ بیتی سناتی ہیں، اس بات کا باقاعدہ دھیان رکھتے ہوئے کہ کہانی سننے والا بنا اُوبھے، بنا جمہائی لیے اس کے شبدوں کی پرتیکھشا کرے اور اس کا دھیان اِدھر اُدھر نہ ہٹے۔ دوسری اور وہ او ہنری اور موپاساں جیسے اُچ کوٹی کے کتھا شلپیوں سے وراثت میں ملی تکنیک کا بڑی خوبی سے استعمال کرتی ہیں۔

انتم جملے یا انتم پیراگراف میں کہانی کو اپرتیاشت و (UNPREDICTABLE) موڑ دیکر کسی خوب صورت مالوحولیہ کو کہانی پڑھنے یا سننے والوں کے دلوں پر اتار دینا اور پھر انھیں سلگتی تڑپ کی صورت میں چھوڑ دینا اس تکنیک کا اپیوگ بانو سرتاج نے کئی کہانیوں میں بڑی کُشلتا کے ساتھ کیا ہے۔

ان کی کہانیوں کی ایک اور وشیشتا ہے ہر دینا لیکھک اور اس کی ستھیتیوں کے بیچ دوھندے اُبھرتی ہے جس انوپات میں لیکھک ستھیوں کی جکڑن کو توڑنے اور ان سے اوپر اٹھنے، ان سے مُکت ہونے کی کوشش کرتا ہے اُسی انوپات میں رچنا شریشٹ بنتی ہے۔

بانو سرتاج کی کہانیوں میں اپنی ستھتیوں کے دائرے سے باہر نکلنے کی کوشش سپشٹ دکھائی دیتی ہے۔

اس لیے ان کی کہانیاں نہ تو استری پُرش سمبندھوں تک سیمت ہیں جیسا کہ پرائے مہیلا لیکھن میں دیکھا جاتا ہے اور نہ ہی الپ سنکھیک اسور کھشا اور بھیتیوں سے جکڑی ہیں۔ جیسا کہ عام طور پر الپ سنکھیک ورگ کے لیکھکوں کے

ورق میں دکھائی دیتا ہے۔

بانو کی کہانیوں کو پڑھنے کے بعد ایک تیکھا احساس ہوتا ہے کہ ہمارا ساہتیہ پرشوں اور اُچ جاتیوں کے لیکھکوں پر ہی نربھر رہ کر کتنا ادھورا اور کتنا اک طرفہ ہے۔

بلراج ورما

# بانو کی باتیں

ریڈیو، سنیما اور ٹی وی۔ سماجی سیاسی اور فلمی جریدے ڈیلی اور ویکلی اخبارات۔ ان سب کا مقام اور اثر ورسوخ مسلم ہے دین دھرم فلسفہ سائنسی علوم ادب اور آرٹ کے بارے میں بھی جتنا جیسا اور جیسے ان تجارتی اداروں کے ذریعے ہم تک پہنچ رہا ہے وہ بھی ہم پر عیاں ہے۔ یہ ایسی سہولیات ہیں جن کے بغیر عصری زندگی کا تصور تقریباً ناممکن ہے۔

یہ سب ہے مگر نہ شعر و نغمہ کا الاپ ٹوٹا ہے۔ نہ فکشن کے چشمے ہی سوکھے ہیں۔ اچھی شاعری اور قابلِ قبول کہانی دونوں زندہ ہیں۔ ادبی کتابیں بدستور لکھی اور چھاپی جا رہی ہیں۔ مقصد تجارتی ہو یا نام نمود کا تحفظ و فروغ۔

شہرتِ عام ہر فنکار کا حق اور مناسب داد سے اُسے نوازنا ہر معاشرے کا فرض ہے۔ اس کتاب کو منظرِ عام پر لانے کا بھی یہی مقصد ہے۔

بانو سرتاج ہندی ساہتیہ جگت کا ایک جانا مانا نام ہے۔ ان کی کہانیوں کے تین مجموعے ہندی میں شائع ہو چکے ہیں۔ چونکہ وہ پچھلے پچیس سال سے اردو میں بھی برابر لکھتی رہی ہیں اس لئے مناسب سمجھا گیا کہ ان کی کہانیوں کا انتخاب اردو میں بھی شائع ہو۔ اس کی تحریک ہمیں ناظر کے جنوبی ہند کے ایڈیٹر اقبال متین سے ملی۔ بانو سرتاج سے ان کے تعلقات کا آغاز ۱۹۶۶ - ۱۹۶۷ء کے لگ بھگ ہوا تھا جب وہ مرحوم سلیمان اریب کے مشہور ادبی جریدے "صبا" کا افسانوی حصہ مرتب کیا کرتے تھے۔ بانو کی ادبی زندگی (Development and Growth) کا جائزہ وہ تب ہی سے لیتے آ رہے ہیں اور جان گئے ہیں کہ وہ خوب اور خوب تر لکھنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ ان کی کہانیوں کی اثر پذیری اور غیر معمولی دلکشی کا سارا حسن، موضوع اور اسلوب [illegible] بننے کی ہنرمندی کے سبب سے ہے۔

افسانے کا سب سے اہم عنصر جذبہ ہوتا ہے۔ یہ جذبہ ہی فنکار کے خیالات جذبات اور احساسات کا۔ بلکہ میں تو کہوں گا کہ لفظیات کی دروں بینی کا بھی منبع ہوتا ہے۔ کہانی کو اپنی شناخت اور اپنے ادبی مقام کے تعین کے لئے فنکار اور قاری کے دائمی رشتے کی مرہون منت رہنا ہوتا ہے۔ اس رشتے کی بقا کے لئے دونوں کے مابین جذباتی لگاؤ کے علاوہ سہل اور ہموار آمد و رفت ضروری ہے۔ یہ دِل کا درد کا رشتہ ہے۔

کہانی کے دوسرے اہم عناصر ہیں۔ پلاٹ، منظر، کردار اور جزئیات نگاری مقصدیت، اسلوب، اور موضوع ہیں ان سب کو سمیٹ کر ایک زندہ دھڑکتی ذی روح شبیہ میں منتقل کر کے صفحوں پر اتارنے کا سلیقہ ——— بانو سرتاج اچھی فنکارہ ہیں اور کہانی کے ان سب جوہرات سے آشنا ہیں۔

ہر نئی کتاب ادب میں اضافہ نہیں ہوتی مگر "دائروں کے قیدی" یقیناً ایک عمدہ سوغات اور اردو کے افسانوی ادب میں ایک قابل قدر اضافہ ہے۔ اقبال متین اور ڈاکٹر ست رام کپور (جو ایک صدی با تجھ جیسا صحیح اور کیر اثر ناول لکھ کر ہندی ساہتیہ میں اپنا ایک منفرد مقام بنا چکے ہیں) نے خاصے گہرے اور تفصیلی انداز میں بانو سرتاج کے فکر و فن کا جائزہ لیا ہے لہٰذا اِس سلسلے میں مزید کچھ کہنا فی الحال ضروری نہیں باوجودیکہ اِس سلسلے میں کہنے کے لئے میرے پاس بھی کافی کچھ ہے۔

اچھی کہانیوں پر لمبی چوڑی تمہید بھی غیر ضروری سمجھی جاتی ہے کیونکہ ادب کے پارکھ قاری اِس قسم کی مداخلت پسند نہیں کرتے۔

اِس مجموعے کا نام "دائروں کے قیدی" ہم نے چنا ہے۔ شاید اسی لئے اقبال متین نے اِس کہانی کے بارے میں کچھ نہیں کہا۔

یہ کہانی معاشرے کی ان مثبت اور منفی قدروں کی کتھا ہے جن سے ہم سب بانوس ہیں۔ دلدل میں پھنسی قدریں آسمانوں میں پرندوں کی آزاد اڑانیں ایسی قدریں اونچی سے اونچی تعلیم اور بڑے سے بڑا عہدہ بھی آدمی کو اُس کے سنسکاروں اور اُن خود غرضانہ رویوں سے چھٹکارہ نہیں دلا سکتا ہے جن سے اس کے ذہن و شعور کی نشو و نما ہوتی ہے۔ اس کہانی کی نایکہ اپنے شوہر کی الجھن کی وجہ

سمجھتی ہے۔ اس کا حل بھی جانتی ہے مگر اس حل تک پہنچنے کا نہ راستہ جانتی ہے نہ طریقہ معروف جرمن دانشور کارل فریڈرک غوص کے الفاظ ہیں۔

I have had my solutions for a long time But I do not yet know how I am to arrive at them. Karl Friedrich Gauss, Germany, 1777-1855

بانو سرتاج اچھی، بہت اچھی فنکارہ ہیں۔ انھیں لگاتار پڑھتے رہنے سے جس قسم کی توقعات وابستہ کی جا سکتی تھیں وہ پوری ہو رہی ہیں۔

میری آرزو اور دعا ہے خدائے بزرگ و برتر کے حضور میں کہ وہ اس اُبھرتی ہوئی فنکارہ کو اپنے حفظ و امان میں رکھے اور اس کی زندگی کا ہر نیا سال ہر پچھلے سال سے زیادہ USEFUL اور CREATIVE ثابت ہو۔ آمین

تخلیقی ادب کی دستاویز
بانو سرتاج
سلسلۂ مطبوعات، تناظر پبلی کیشنز
TANAZUR PUBLICATIONS,
24-D, POCKET III, MAYUR VIHAR, DELHI